Urdu Translation of Tom G. Palmer's
"The Morality of Capitalism"

ٹام جی پالمر

مترجم: مشتاق درانی

سرمایہ دارانہ نظام
اور
اخلاقیات

سرمایہ دارانہ نظام اور اخلاقیات

تعارف: سرمایہ دارانہ نظام اور اخلاقیات

ٹام جی پالمر

یہ کتاب اس کے اخلاقی جواز کے بارے میں ہے جسے فلسفی رابرٹ نوزک نے "رضا مند بالغوں کے درمیان سرمایہ دارانہ عمل" قرار دیا ہے۔ یہ کو آپریٹو پیداوار اور آزاد تبادلے کے نظام کے بارے میں ہے جس کی خصوصیت اس طرح کی کارروائیوں کی برتری سے ہے۔

ٹائٹل "سرمایہ دارانہ نظام اور اخلاقیات" بارے چند الفاظ درجہ ذیل ہیں۔ اس کتاب کے مضامین سرمایہ داری کی اخلاقیات کے بارے میں ہیں، یہ تجریدی اخلاقی فلسفے تک محدود نہیں ہیں بلکہ معاشیات، منطق، تاریخ، ادب اور دیگر شعبوں پر بھی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ مضامین سرمایہ داری کی اخلاقیات کے بارے میں ہیں، نہ کہ محض آزادانہ تبادلے کی اخلاقیات کے بارے میں۔ "سرمایہ داری" کی اصطلاح سے مراد صرف اشیاء اور خدمات کے تبادلے کے لیے منڈیوں سے نہیں ہے، جو زمانہ قدیم سے موجود ہیں، بلکہ جدت، دولت کی تخلیق اور سماجی تبدیلی کے نظام سے ہے جس نے اربوں لوگوں کی زندگیوں میں خوشحالی لائی ہے جس کا انسانوں کی پہلی نسلوں کے لیے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سرمایہ داری یا سرمایہ دارانہ نظام سے مراد ایک قانونی، سماجی، اقتصادی اور ثقافتی نظام ہے جو حقوق کی مساوات اور "ہنر مندوں کے لیے کھلے کیریئر" کو قبول کرتا ہے اور جو وکندریقرت اختراعات (Decentralization) اور آزمائش اور غلطی کے عمل کو مارکیٹ ایکسچینج کے رضاکارانہ عمل کے ذریعے تقویت دیتا ہے، جسے ماہر اقتصادیات جوزف شمپیٹر نے "تخلیقی تباہی" کہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کاروباری، سائنسدان، خطرہ مول لینے والے، اختراع کرنے والے اور تخلیق کاروں کو مانتی اور انکا احترام کرتا ہے۔ اگرچہ فلسفیوں (خاص طور پر مارکسسٹ) جو خود مادیت کے پیروکار ہیں، کی طرف سے مادیت پسندی کے طور پر طنز کیا جاتا ہے کہ سرمایہ داری اصل میں ایک روحانی اور ثقافتی ادارہ ہے۔ جیسا کہ مؤرخ جوائس ایپلبی نے اپنی حالیہ تحقیق The Relentless Revolution: A History of Capitalism میں ذکر کیا ہے کہ "کیونکہ سرمایہ داری ایک ثقافتی نظام ہے نہ کہ صرف ایک معاشی، اس لیے اس کی وضاحت صرف مادی عوامل سے نہیں کی جا سکتی۔"

سرمایہ داری ثقافتی، روحانی اور اخلاقی اقدار کا ایک نظام ہے۔ جیسا کہ ماہرین اقتصادیات ڈیوڈ شواب اور ایلنور آسٹروم نے کھلی معیشتوں کو برقرار رکھنے میں اصولوں اور اسکے کردار کے ایک بنیادی گیم تھیوریٹک مطالعہ (A Seminal Game-Theoretic Study of the Role of Norms and Rules in Maintaining Open Economies) میں ذکر کیا ہے کہ، آزاد منڈیاں ان اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہتی ہیں جو ہمیں چوری کرنے سے روکتی ہیں اور جو کہ "اعتماد بڑھاتی" ہیں۔ سرمایہ داری ایک غیر اخلاقی میدان نہیں ہے جہاں مفادات کی ٹکراؤ ہوتی ہے، جیسا کہ اکثر ان لوگوں کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے جو اسے کمزور کرنے یا تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ سرمایہ دارانہ

تعامل اخلاقی اصولوں اور قواعد کے ذریعے بہت زیادہ منظم ہوتا ہے۔ درحقیقت، سرمایہ داری لوٹ مار اور قبضے کی اخلاقیات کو مسترد کرتی ہے، جو کہ وہ طریقے ہیں جن کے ذریعے زیادہ تر دولت، جو دولت مندوں کے پاس ہے، دوسرے اقتصادی اور سیاسی نظاموں میں حاصل کی گئی ہے۔ (اصل میں، آج کے بہت سے ممالک اور انسانی تاریخ کے زیادہ تر حصے میں یہ وسیع پیمانے پر سمجھا جاتا ہے کہ جو لوگ امیر ہیں، وہ اس لیے امیر ہیں کہ انہوں نے دوسروں سے لیا، اور خاص طور پر اس وجہ سے کہ انہیں منظم طاقت تک رسائی حاصل ہے—آج کے الفاظ میں، ریاست۔ ایسے شکار کرنے والے طبقے اس طاقت کا استعمال کرتے ہیں تاکہ اجارہ داری حاصل کریں اور دوسروں کی پیداوار کو ٹیکس کے ذریعے ضبط کریں۔ وہ ریاستی خزانے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ریاستی اجارہ داریوں اور مقابلے پر پابندیوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ صرف سرمایہ داری کے تحت لوگ عام طور پر امیر ہوتے ہیں بغیر کہ وہ مجرم ہوں۔)

معاشیات اور تاریخ کی ماہر ڈیئرڈری مک کلاسکی کے مطابق "عظیم حقیقت" ("The Great Fact") پر غور کریں: "آج کل فی کس حقیقی آمدنی 1700 یا 1800 کے دور کے برطانیہ اور دیگر ممالک میں موجود آمدنی سے کم از کم سولہ گنا زیادہ ہے جنہوں نے جدید اقتصادی ترقی کا تجربہ کیا ہے۔" یہ انسانی تاریخ میں بے مثال ہے۔ دراصل، مک کلاسکی کا تخمینہ کافی محتاط ہے۔ یہ سائنسی اور تکنیکی ترقیات کو مد نظر نہیں رکھتا جو دنیا کی ثقافتوں کو ہمارے ہاتھوں کی لکیروں پر لے آئی ہیں۔

سرمایہ داری انسانی تخلیقیت کو انسانیت کی خدمت میں لگاتی ہے، انٹرپرینیوریل جدت کو عزت اور فروغ دے کر، وہ عنصر ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ ہم آج کیسے جیتے ہیں اور ہمارے آباؤاجداد

نے انیسویں صدی سے پہلے کی نسلوں میں کیسے جیا۔ وہ جدتیں جنہوں نے انسانی زندگی کو بہتر بنایا ہے صرف سائنسی اور تکنیکی نہیں بلکہ ادارہ جاتی بھی ہیں۔ نئی کاروباری کمپنیاں ہر قسم کی رضاکارانہ طور پر بے شمار لوگوں کی محنت کو ہم آہنگ کرتی ہیں۔ نئے مالیاتی بازار اور آلات دن کے بیس گھنٹے اربوں لوگوں کی بچت اور سرمایہ کاری کے فیصلوں کو آپس میں جوڑتے ہیں۔ نئی ٹیلی کمیونیکیشن نیٹ ورک دنیا کے کونے کونے سے لوگوں کو یکجا کرتے ہیں۔ (آج میں نے فن لینڈ، چین، مراکش، امریکہ اور روس میں دوستوں سے بات چیت کی، اور امریکہ، کینیڈا، پاکستان، ڈنمارک، فرانس اور کرغزستان میں دوستوں اور جاننے والوں سے فیس بک پر تبصرے اور پیغامات موصول کیے۔) نئے مصنوعات ہمیں ایسے آرام، خوشی اور تعلیم کے مواقع فراہم کرتی ہیں جو پچھلی نسلوں کے لیے ناقابل تصور تھے۔ (میں یہ اپنے ایپل میک بک پرو پر لکھ رہا ہوں۔) ان تبدیلیوں نے ہمارے معاشروں کو ان گنت طریقوں سے تمام سابقہ انسانی معاشروں سے نمایاں طور پر مختلف بنا دیا ہے۔

سرمایہ داری صرف اشیاء تعمیر کرنے کے بارے میں نہیں ہے، جیسے کہ سوشلسٹ آمر اپنے غلاموں سے "مستقبل بناؤ!" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ سرمایہ داری قدر تخلیق کرنے کے بارے میں ہے، صرف محنت کرنے، قربانیاں دینے یا مصروف رہنے کے بارے میں نہیں۔ جو لوگ سرمایہ داری کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں، وہ "ملازمتیں تخلیق کرنے" کے پروگراموں کی حمایت کرنے میں جلدی کرتے ہیں تاکہ کام پیدا کیا جا سکے۔ وہ کام کی اہمیت کو صحیح طرح سے نہیں سمجھتے، اور سرمایہ داری کی اہمیت تو بہت دور کی بات ہے۔ ایک مشہور کہانی میں، ماہر اقتصادیات ملٹن فریڈمین کو ایشیا میں ایک بڑے نئے نہر کی تعمیر دکھائی گئی۔ جب انہوں نے نوٹ کیا کہ یہ عجیب ہے کہ مزدور بڑے بڑے حجم کی مٹی اور پتھر چھوٹے

بیلچے کے ذریعے منتقل کر رہے ہیں، بجائے اس کے کہ مٹی ہٹانے کے آلات استعمال کریں، تو انہیں بتایا گیا " آپ نہیں سمجھتے؛ یہ ایک ملازمتیں تخلیق کرنے کا پروگرام ہے۔" ان کا جواب تھا: " اوہ، میں نے سوچا کہ آپ ایک نہر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر آپ ملازمتیں تخلیق کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے انہیں بیلچوں کی بجائے چمچے کیوں نہیں دیے؟"

سوداگر اور یار پرور (cronyist) ہنری راس پیروٹ، جب 1992 میں امریکہ کے صدر کے لیے انتخاب لڑ رہے تھے، انہوں نے صدارتی مباحثوں کے دوران افسوس کا اظہار کیا کہ امریکی تائیوان سے کمپیوٹر چپس خرید رہے ہیں اور تائیوان کو آلو کے چپس بیچ رہے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ پیرو کو اس بات پر شرمندگی تھی کہ امریکی صرف آلو کے چپس فروخت کر رہے ہیں؛ انہوں نے لینن کے نظریے کو اپنا لیا تھا کہ قیمت صرف صنعتی پیداوار کے ذریعے ہی بڑھتی ہے۔ اسٹینفورڈ یونیورسٹی کے ماہر اقتصادیات مائیکل بوسکن نے صحیح طور پر نوٹ کیا کہ اگر آپ ایک ڈالر کی قیمت کی کمپیوٹر چپس یا ایک ڈالر کی قیمت کے آلو کے چپس کی بات کر رہے ہیں، تو آپ ایک ڈالر کی قیمت کی بات کر رہے ہیں۔ آئیڈاہو میں آلو اگانے یا تائی پے میں سیلیکون کا کندہ لگانے سے قیمت بڑھانا اسکی قدر میں اضافہ ہے۔ تقابلی فائدہ مہارت اور تجارت کی کلید ہے،؛ قیمت یا قدر بڑھانے میں ، چاہے آپ ایک کسان ہوں، فرنیچر منتقل کرنے والے ہوں (آج میں نے اپنے لائبریری کے بہت سے حصے کو منتقل کرنے کے لیے تین مویئرز کے ساتھ کام کیا اور مجھے اس بات کا بہت ٹھوس احساس ہے کہ انھوں نے میری زندگی میں اپنی اہمیت کا کتنا اضافہ کیا ہے)، مالیاتی ماہر ہوں وغیرہ، کوئی بھی بات ذلت آمیز نہیں ہے۔ سرمایہ داری صرف مقامی مارکیٹوں میں مکھن اور انڈے کی تجارت کے بارے میں نہیں ہے، جو ہزاروں سال سے جاری ہے۔ یہ انسانی توانائی اور ذہانت کی ایسی پیمانے پر

قیمت بڑھانے کے بارے میں ہے جو انسانی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی، عام لوگوں کے لیے ایسی دولت پیدا کرنا جو ماضی کے امیر ترین اور طاقتور ترین بادشاہوں، سلطانوں اور شہنشاہوں کو حیران کر دیتی۔ یہ طویل عرصے سے جڑی ہوئی طاقت، حکمرانی، اور امتیاز کے نظام کی تحلیل اور "کیریئر ٹو ٹیلنٹ" کے دروازے کھولنے کے بارے میں ہے۔ یہ طاقت کے بجائے قائل کرنے کا عمل ہے۔ یہ حسد کے بجائے کامیابی کا عمل ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے میری زندگی اور آپ کی زندگی کو ممکن بنایا ہے۔مارکیٹ — متکبر تاجر سیاست دان — ہمیں دکھاتا ہے جب ہم قدر میں اضافہ کر رہے ہوتے ہیں، اور آزاد منڈیوں کے بغیر یہ ہم نہیں جان سکتے۔

(بادشاہوں، سلطانوں اور شہنشاہوں کے پاس صرف ایک چیز تھی جو آج کل کے عام لوگوں کے پاس نہیں ہے؛وہ دوسرے لوگوں پر اقتدار اور انہیں حکم دینے کی صلاحیت تھی۔ان کے پاس غلاموں کے ذریعے تعمیر کیے گئے وسیع محلات تھے یا انکو ٹیکسز کے ذریعے مالی اعانت حاصل تھی لیکن ان کے پاس گھروں میں کوئی گرمائش یا ٹھنڈک کیلئے کوئی نظام نہیں تھا۔ غلام اور نوکر تھے لیکن کوئی واشنگ مشین یا ڈش واشر نہیں تھا، کوریئر کی فوجیں تھیں، لیکن کوئی سیل فون یا وائی فائی نہیں تھا؛ دربار کے طبیب اور جادوگر تھے، لیکن ان کے درد کو کم کرنے کے لیے کوئی بے ہوشی کی دوا یا انفیکشنز کو ٹھیک کرنے کے لیے کوئی اینٹی بائیو ٹکس نہیں تھیں؛وہ طاقتور تھے، لیکن ہمارے معیار کے مطابق وہ بے حد غریب تھے)

ایک لفظ کی تاریخ

آزاد منڈیاں، جنہیں افراد کے درمیان واضح، قانونی طور پر محفوظ اور قابل منتقلی حقوق کے ساتھ نایاب وسائل کے آزادانہ تبادلے کے نظام کے طور پر سمجھا جاتا ہے، جدید دنیا کی

دولت کے لئے ضروری ہیں۔ تاہم، اقتصادی مورخین، خاص طور پر ڈیرڈری مک کلوسکی، نے قائل کن طور پر دکھایا ہے کہ یہ ناکافی ہیں۔ ایک اور چیز کی ضرورت ہے اور وہ آزادانہ تبادلے اور جدت کے ذریعے دولت کی پیداوار کی اخلاقیات ہے۔

"سرمایہ داری" کی اصطلاح کے استعمال کے بارے میں کچھ الفاظ کہنا ضروری ہیں۔ سماجی تاریخ دان فرنینڈ براؤڈیل نے "سرمایہ" کی اصطلاح کو بارہویں اور تیرہویں صدیوں کے دور سے منسوب کیا جب اس کا مطلب "فنڈز، سامان کا ذخیرہ، رقم کی مقدار، یا سود لانے والی رقم" ہوتا تھا۔ براڈل نے "سرمایہ دار" کی اصطلاح کے کئی استعمالات کو درج کیا، اور خشک لہجے میں نوٹ کیا، "یہ لفظ کبھی بھی... دوستانہ معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ "سرمایہ داری" کی اصطلاح انیسویں صدی میں عام طور پر بدنامی کے طور پر ابھری، جیسے کہ فرانسیسی سوشلسٹ لوئی بلانک نے اس اصطلاح کو "کچھ لوگوں کے ذریعہ سرمایہ کا اختصاص دوسروں کو خارج کر کے" کے طور پر بیان کیا۔ کارل مارکس نے "سرمایہ دارانہ طرز پیداوار" کی اصطلاح استعمال کی، اور یہ اس کے جوشیلے پیروکار ورنر سومبارٹ تھے جنہوں نے اپنے 1912 میں اپنی بااثر کتاب "Der Moderne Capitalismus" میں "سرمایہ داری" کی اصطلاح کو مقبول بنایا۔ (مارکس کے ساتھی، فریڈرک اینگلز، سومبارٹ کو جرمنی میں واحد مفکر سمجھتے تھے جو واقعی مارکس کو سمجھتا تھا؛ سومبارٹ بعد میں سرمایا داری کے مخالف کی ایک اور شکل نیشنل سوشلزم یعنی نازی ازم کا حامی بن گیا۔)

"سرمایہ داروں" اور "سرمایہ داری کے طریقہ پیداوار" پر اپنے حملے میں، مارکس اور اینگلز نے ذکر کیاہے کہ "بورژوا" (ان کی اصطلاح "طبقہ" کے لیے جو "ذرائع پیداوار" کا مالک تھا) نے دنیا کو انتہائی تبدیل کر دیا ہے:

بورژوا طبقے نے، اپنی سو سالہ مختصر حکومت کے دوران اتنی بڑی اور وسیع پیداواری قوتیں پیدا کی ہیں جو تمام پچھلی نسلوں نے مل کر بھی نہیں کیں۔ قدرتی قوتوں کو انسان کے ماتحت کرنے، مشینری، صنعت اور زراعت میں کیمیاء کے استعمال، بھاپ کی کشتیاں، ریلوے، برقی ٹیلی گراف، پوری براعظموں کو کاشت کے لیے صاف کرنا، دریاؤں کی نہریں بنانا، پوری آبادیوں کو زمین سے باہر نکالنا—پہلی صدیوں نے کب یہ سوچا تھا کہ ایسی پیداواری قوتیں سماجی محنت کے دامن میں سو رہی تھیں؟

مارکس اور اینگلز نے نہ صرف تکنیکی جدت طرازی پر بلکہ "پوری آبادیوں کو زمین سے باہر نکالنے" پر بھی حیرانی ظاہر کی، جو موت کی شرح میں کمی، زندگی کے معیار میں بہتری، اور عمر کی طوالت کو بیان کرنے کا ایک حیرت انگیز طریقہ ہے۔ ایسی کامیابیوں کے باوجود، ظاہر ہے کہ مارکس اور اینگلز نے "سرمایہ داری کے طریقہ پیداوار" کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا، یا، زیادہ درست طریقے سے، ان کا خیال تھا کہ یہ خود کو تباہ کر دے گا اور ایک نئے نظام کا آغاز کرے گا جو اتنا شاندار ہو گا کہ اس کے کام کرنے کے طریقے کی معمولی سی بھی وضاحت دینی بھی ضروری نہیں— بلکہ، یہ مکمل طور پر غیر سائنسی تھا—کہ اس کے کام کرنے کے طریقے کا ہلکا سا اشارہ بھی دیا جائے۔

اہم بات یہ ہے کہ مارکس اور اینگلز نے اپنی سرمایہ داری پر تنقید کو بنیاد دی (ایک ایسی تنقید جو، تمام کمیونسٹ نظاموں کی ناکامی کے باوجود اپنی وعدوں کو پورا کرنے میں، دنیا بھر کے دانشوروں میں غیر معمولی طور پر اثر و رسوخ رکھتی ہے) ایک بڑے الجھن کے سلسلے پر کہ وہ "بورژوازی" کے اصطلاح سے کیا مراد رکھتے تھے، جسے انہوں نے "سرمایہ داری کے طریقہ پیداوار" سے جوڑا۔ ایک طرف، وہ اس اصطلاح کو "سرمایہ" کے مالکان کے معنی میں استعمال

کرتے ہیں جو پیداواری کاروباروں کو منظم کرتے ہیں، لیکن دوسری طرف، وہ اسے ان لوگوں کے لیے استعمال کرتے ہیں جو ریاست اور اس کی طاقت پر منحصر ہیں، جیسا کہ مارکس نے اپنی سیاست پر ایک انتہائی دلچسپ مضمون میں کیا تھا:

فرانسیسی بورژوازی کا مادی مفاد انتہائی حد تک وسیع اور انتہائی پیچیدہ ریاستی مشینری کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہی مشینری اپنی زائد آبادی کو نوکریاں فراہم کرتی ہے اور ریاستی تنخواہوں کے ذریعے ان چیزوں کی تلافی کرتی ہے جو اسے منافع، سود، کرایہ، اور فیس کی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس کا سیاسی مفاد بھی اسی طرح اسے روزانہ جبر اور اس کے لیے ریاستی طاقت کے وسائل اور عملے میں اضافہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

تو ایک طرف، مارکس نے "بورژوازی" کو ان کاروباری افراد کے ساتھ جوڑا جو "ہر ملک میں پیداوار اور کھپت کو ایک بین الاقوامی کردار دیتے ہیں"، جو "قومی یک طرفہ پن اور تنگ نظری" کو "زیادہ سے زیادہ ناممکن" بناتے ہیں، جنہوں نے "عالمی ادب" تخلیق کیا، جنہوں نے "پیداوار کے تمام آلات میں تیز رفتار بہتری" لائی اور "ذرائع ابلاغ کو بے حد آسان بنایا"، اور جنہوں نے "اجناس کی سستی قیمتوں" کے ذریعے "غیر ملکیوں سے وحشیوں کی ضد اور نفرت" کو ختم کیا۔ دوسری طرف، انہوں نے "بورژوازی" کا استعمال ان لوگوں کے لیے کیا جو "عوامی قرض" (یعنی، حکومت کے قرض) پر زندگی گزارتے ہیں۔

پورا جدید مالیاتی بازار اور بینکنگ کا کاروبار، عوامی قرض کے ساتھ انتہائی قریب سے جڑا ہوا ہے۔ ان کے کاروباری سرمایہ کا ایک حصہ لازمی طور پر قلیل مدتی عوامی فنڈز میں سود پر لگا ہوا ہوتا ہے۔ ان کی جمع پونجی، وہ سرمایہ جو تاجروں اور صنعتکاروں نے ان کے اختیار میں دیا ہوتا ہے اور جسے وہ دوبارہ ان ہی لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں، جزوی طور پر حکومت کے بانڈز کے

حاملین کے منافع سے حاصل ہوتا ہے۔

مارکس نے "بورژوازی" کو ریاستی مشینری پر قابو پانے کی جدوجہد میں ملوث اور فائدہ اٹھانے والا کے طور پر دیکھا: تمام سیاسی انقلابات نے اس مشین کو توڑنے کے بجائے اسے تکمیل دی۔ وہ پارٹیاں جو باری باری غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھیں، اس عظیم ریاستی عمارت کے قبضے کو فتح کی اصل لوٹ سمجھتی تھیں۔

مورخ شیر لی گرونر کے بقول، "مارکس کو لگا کہ جب اس نے 'بورژوازی' کو پایا تو اس نے حقیقت پر گرفت حاصل کرلی ہے، لیکن در حقیقت، اس نے صرف ایک بہت ہی پھسلتی ہوئی اصطلاح کو پکڑا تھا۔" بعض تحریروں میں، مارکس نے اس اصطلاح کو ان جدت پسند کاروباری افراد کے لیے استعمال کیا جو پیداواری کاروبار منظم کرتے ہیں اور دولت کی تخلیق میں سرمایہ لگاتے ہیں، اور دوسری تحریروں میں، اس نے اسے ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جو ریاست کے گرد جمع ہوتے ہیں، جو ٹیکسوں پر زندگی گزارتے ہیں، جو مقابلہ ممنوع کرنے اور تجارت کی آزادی کو محدود کرنے کے لیے لابنگ کرتے ہیں؛ مختصر یہ کہ ان لوگوں کے لیے جو دولت تخلیق کرنے میں نہیں بلکہ دوسروں کی دولت کو تقسیم یا تباہ کرنے کی طاقت حاصل کرنے میں سرمایہ لگاتے ہیں، اور بازاروں کو بند رکھنے، غریبوں کو ان کی جگہ پر رکھنے، اور معاشرے کو اپنے ماتحت رکھنے میں سرمایہ لگاتے ہیں۔

مارکس اور اس کے پیروکار سومبارٹ کے اثر ورسوخ کی وجہ سے، "سرمایہ داری" کی اصطلاح عام استعمال میں آئی۔ یہ یاد رکھنا اہم ہے کہ اس اصطلاح کو ان لوگوں نے مقبول بنایا جنھوں نے نہ صرف پیداواری کاروبار اور بازار کے تبادلے کو دوسروں سے لیے گئے ٹیکسوں پر

زندگی گزار کر الجھادیا، بلکہ جو جائیداد، بازاروں، پیسے، قیمتوں، محنت کی تقسیم، اور لبرلزم کے پورے ڈھانچے: انفرادی حقوق، مذہبی آزادی، اظہار رائے کی آزادی، قانون کے سامنے مساوات، اور آئینی طور پر محدود جمہوری حکومت کے خاتمے کی وکالت کرتے تھے۔

غیر معمولی طور پر، کئی دیگر گالیوں کی طرح "سرمایہ داری" کی اصطلاح کو بعض ان ذہین لوگوں نے اپنایا جو آزاد بازاروں کے حامی تھے اور جن کے خلاف یہ اصطلاح استعمال کی گئی تھی۔ اپنی تاریخ کے نتیجے میں جو لوگ "سرمایہ داری" کی اصطلاح کو اپنے نظریات کے لیے یا صرف سماجی سائنسی بحث کے لیے ایک غیر جانبدار اصطلاح کے طور پر اپناتے تھے، انہیں اس بات سے نقصان پہنچتا تھا کہ اس اصطلاح کو غیر مشروط طور پر استعمال کیا جاتا تھا (آزاد بازار کے کاروباریوں اور ٹیکسوں اور حکومتی طاقت اور سرپرستی پر زندگی گزارنے والوں دونوں کے لیے) اور یہ تقریباً ہمیشہ ایک واضح منفی طریقے سے استعمال ہوتی تھی۔

کچھ لوگ تجویز کرتے ہیں کہ اس اصطلاح کو مکمل طور پر ترک کر دینا چاہیے کیونکہ اس کے بہت سارے متضاد معانی اور نظریاتی پہلو ہیں۔ یہ کشش پیدا کرتا ہے، لیکن ایک مسئلہ باقی رہتا ہے۔ لوگوں کو آزادانہ طور پر تجارت کرنے کی اجازت دینا اور نفع و نقصان سے رہنمائی حاصل کرنا، اگرچہ یقیناً معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے، لیکن جدید دنیا کی تخلیق کے لیے کافی نہیں ہے۔ جدید بازار نہ صرف ادارہ جاتی، تکنیکی، ثقافتی، فنی، اور سماجی جدتوں کے طوفان سے ابھرے بلکہ اسے بھی ہوا دی جو کہ انڈے کے بدلے مکھن کے تبادلے کے ماڈل سے کہیں آگے ہے۔ جدید آزاد بازار کی سرمایہ داری نہایت تیزی سے جدت طرازی کرتی ہے — یہی وہ چیز تھی جو سماجی وادیوں (خاص طور پر مارکس) اور ان کے اتحادیوں، بازار مخالف

قدامت پسندوں، کو جدید دنیا کے بارے میں بہت خوفناک لگتی تھی۔ اپنی کتاب "کیپیٹلزم، سوشلزم اور ڈیموکریسی" میں، جوزف شومپیٹر نے ان لوگوں پر تنقید کی جن کے لیے "مسئلہ عام طور پر یہ ہے کہ سرمایہ داری موجودہ ڈھانچوں کا انتظام کیسے کرتی ہے، جبکہ متعلقہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ انہیں کیسے تخلیق اور تباہ کرتی ہے۔"

جدید آزاد بازار صرف تبادلے کی جگہیں نہیں ہیں، جیسے کہ پرانے دور کے بازار میلے تھے۔ یہ "تخلیقی تباہی" کی لہروں کی خصوصیت رکھتے ہیں؛ جو چیز دس سال پہلے نئ تھی، وہ اب پرانی ہو چکی ہے، اور نئی ورژنز، نئے آلات، ادارہ جاتی انتظامات، ٹیکنالوجیز، اور تعامل کے نئے طریقے جو کسی نے بھی نہیں سوچے تھے، اسے تبدیل کر چکے ہیں۔ یہی چیز جدید آزاد بازاروں کو پرانے بازاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ میرے خیال میں، جدید دنیا کو بنانے والے آزاد مارکیٹ تعلقات کو ان بازاروں سے ممتاز کرنے کے لیے بہترین دستیاب اصطلاح "سرمایہ داری" ہے۔

تاہم، سرمایہ داری ایک بے ترتیبی کی شکل نہیں ہے۔ یہ ایک بے ساختہ ترتیب کی شکل ہے جو ایک عمل سے ابھرتی ہے۔ (کچھ مصنف ایسی ترتیبات کو "ابھرتی ہوئی ترتیبات (ایمرجنٹ آرڈرز)" کہتے ہیں۔) ایسی جدت طرازی کو قانون کی حکمرانی اور حقوق کے تحفظ کی پیش قیاسی کی ثابت قدمی ممکن بناتی ہے۔

جیسے کہ ڈیوڈ بوز نے "دی فیوچر سٹ" میں ذکر کیا ہے:

لوگوں کو ہمیشہ ظاہری طور پر بے ترتیب بازار میں نظم (ترتیت) دیکھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ حالانکہ قیمتوں کا نظام مستقل طور پر وسائل کو ان کے بہترین استعمال کی طرف منتقل کرتا ہے، لیکن ظاہری طور پر مارکیٹ ترتیب کے بالکل برعکس نظر آتی ہے—کاروبار ناکام

ہوتے ہیں، ملازمتیں ضائع ہوتی ہیں، لوگ غیر مساوی رفتار سے ترقی کر رہے ہوتے ہیں اور سرمایہ کاری بیکار ثابت ہوتی ہے۔ تیز رفتار جدت طرازی کا دور اور بھی زیادہ بے ترتیب نظر آئے گا، بڑے کاروبار پہلے سے زیادہ تیزی سے ابھرتے اور گرتے ہیں، اور لوگوں کو طویل مدتی ملازمتیں کم ملتی ہیں۔ تاہم، نقل و حمل، مواصلات، اور سرمایہ کے بازاروں کی بڑھتی ہوئی کارکردگی حقیقت میں صنعتی دور کے بازار سے زیادہ ترتیب اور نظم کا مطلب ہو گی۔ نقطہ یہ ہے کہ جبر پر مبنی حکومت کا استعمال کرتے ہوئے "زیادتیوں کو ہموار کرنے" یا "بازار کو کسی کے مطلوبہ نتائج کی طرف مائل کرنے" سے گریز کیا جائے۔

فری مارکیٹ کیپٹلزم بمقابلہ کرونی کیپٹلزم

سوشلسٹ دانشوروں کی طرف سے "سرمایہ داری" کی اصطلاح کے مبہم استعمال کی وجہ سے

پیدا ہونے والی الجھن سے بچنے کے لیے، "آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری" (فری مارکیٹ کیپٹلزم) کو "کرونی کیپیٹل ازم" سے واضح طور پر ممتاز کرنا چاہیے، یعنی ایسے نظام سے جو بہت سے ممالک کو بدعنوانی اور پسماندگی میں ڈبوتا ہے۔ بہت سے ممالک میں، اگر کوئی امیر ہے، تو بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ (خواتین کی کمی کے ساتھ) سیاسی طاقت رکھتا ہے یا ان لوگوں کا قریبی رشتہ دار، دوست، یا حامی ہے—ایک لفظ میں، "کرونی"—جو اصل میں طاقت رکھتے ہیں، اور اس شخص کی دولت، قابل قدر اشیاء کے پیدا کرنے والے ہونے سے نہیں، بلکہ ریاست کی جانب سے کچھ لوگوں کو دوسروں کی قیمت پر دی جانے والی مراعات سے آئی ہے۔ افسوس کے ساتھ، "کرونی کیپیٹل ازم" ایک ایسی اصطلاح ہے جو امریکہ کی معیشت پر بھی بڑھتی ہوئی درستگی کے ساتھ لاگو کی جاسکتی ہے، ایک ملک جہاں ناکام فرموں

کو باقاعدگی سے ٹیکس دہندگان کے پیسوں سے "بیل آؤٹ" کیا جاتا ہے، جہاں قومی سرمایہ زیادہ تر "کرایہ لینے والوں "لابی کرنے والوں، بیوروکریٹس، سیاستدانوں، مشیروں، اور ہیکس کا ایک چھتہ ہوتا ہے، اور جہاں خزانہ اور مرکزی بینک (فیڈرل ریزرو سسٹم) کے مقرر کردہ اہلکار کچھ فرموں کو انعام دیتے ہیں اور دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایسے بدعنوان کرونی ازم کو "آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری" سے الجھانا نہیں چاہیے، جو ایک ایسے نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے جو قانون کی حکمرانی، تمام کے لیے حقوق کی برابری، انتخاب کی آزادی، تجارت کی آزادی، جدت کی آزادی، نفع و نقصان کی رہنمائی، اور اپنی محنت، اپنی بچت، اور اپنی سرمایہ کاری کے فوائد سے لطف اندوز ہونے کا حق پر مبنی ہے، بغیر اس کے کہ ان لوگوں سے ضبط یا پابندی کا خوف ہو جو دولت کی پیداوار میں نہیں بلکہ سیاسی طاقت میں سرمایہ لگاتے ہیں۔

آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری جو تبدیلی کی لہریں پیدا کرتی ہے، مضبوط اشرافیہ کے نزدیک ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں۔ جیسے وہ دنیا کو دیکھتے ہیں، اقلیتیں بغاوت کرنے لگتی ہیں اور نچلی طبقے کے لوگ اب اپنے مقام کو نہیں جانتے۔ ان کے نظریے سے مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری کے تحت خواتین اپنی قدر کو تسلیم کراتی ہیں۔ حیثیت کو کمزور کیا جاتا ہے۔ لوگ انتخاب اور رضامندی پر مبنی تعلقات بناتے ہیں، نہ کہ پیدائش یا حیثیت پر۔ آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری سے قدامت پسندوں کی نفرت، جسے مارکس نے اپنے تحریروں میں خوبصورتی سے خلاصہ اور شامل کیا، ایسی تبدیلی پر غصے اور اکثر امتیاز کے نقصان پر غصے کی عکاسی کرتی ہے۔ لیو میلامڈ (سی ایم ای گروپ کی ایمرٹس چیئرمین، جن کی اپنی زندگی کی کہانی جو گیسٹاپو اور کے جی بی سے بچ نکلنے اور عالمی مالیات میں انقلاب لانے کی کہانی ہے، ایک

بہادری اور وژن کی کہانی ہے) نے اپنے تجربے کی بنیاد پر کہا کہ "شکاگو کے مالیاتی بازاروں میں اسکی کوئی اہمیت نہیں کہ آپ کیا ہیں—آپ کا ذاتی نسب، آپ کا خاندانی پس منظر، آپ کی جسمانی کمزوریاں، آپ کا جنس کیا ہے—بلکہ آپ کی صلاحیت یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ آپکا گاہگ کیا چاہتا ہے اور مارکیٹ کس طرف جا رہا ہے، اور کچھ بھی اہم نہیں ہے۔" آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری کو اپنانا یعنی تبدیلی، جدت طرازی، اور ایجاد کی آزادی کو اپنانا ہے۔ اس کا مطلب ہے تبدیلی کو قبول کرنا اور دوسروں کی آزادی کا احترام کرنا کہ وہ جو کچھ ان کا ہے اس کے ساتھ جیسے چاہیں سلوک کریں۔ اس کا مطلب ہے نئ ٹیکنالوجیز، نئ سائنسی نظریات، نئ فنون کی صورتیں، نئ شناختیں، اور نئے تعلقات کے لیے جگہ بنانا۔ اس کا مطلب ہے دولت تخلیق کرنے کی آزادی کو اپنانا، جو غربت کے خاتمے کا واحد ذریعہ ہے۔ (دولت کی وجوہات ہیں، لیکن غربت کی نہیں؛ غربت وہ ہے جو نتیجہ بنتی ہے اگر دولت کی پیداوار نہیں ہوتی، جبکہ دولت وہ نہیں ہے جو نتیجہ بنتا ہے اگر غربت کی پیداوار نہیں ہوتی۔) اس کا مطلب ہے انسانی آزادی کا جشن منانا اور انسانی صلاحیت کو سمجھنا۔

یہاں پیش کردہ مضامین کے مصنفین کا تعلق مختلف ممالک، ثقافتوں، پیشوں، اور شعبوں سے ہیں۔ ہر ایک اس بات کا تعارف پیش کرتا ہے کہ آزاد مارکیٹ کے تبادلے اخلاقیات میں کیسے جڑے ہوئے ہیں اور اخلاقی رویے کو کیسے مضبوط کرتے ہیں۔ اس انتخاب میں مضامین کی ایک مخلوط فہرست شامل ہے، کچھ بہت مختصر، کچھ لمبے، کچھ کافی قابل رسائی، اور کچھ زیادہ تعلیمی ہیں۔ اس میں دو مضامین بھی شامل ہیں جو پہلے انگریزی میں شائع نہیں ہوئے تھے اور اس کتاب کے لیے چینی اور روسی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ اس میں دو نوبل انعام یافتہ افراد جن میں ایک ناول نویس اور ایک ماہر اقتصادیات ہیں کے مضامین، اور ایک کامیاب

کاروباری شخصیت کے ساتھ انٹرویو بھی شامل ہے جو "آگاہ سرمایہ داری" کا ایک واضح حامی ہے۔ مضامین آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری کے تمام دلائل فراہم نہیں کرتے، لیکن وہ ایک وسیع ادبیات کا تعارف فراہم کرتے ہیں۔ (ان ادبیات کا ایک چھوٹا سا نمونہ کتاب کے آخر میں دی گئی مختصر کتابیات میں شامل ہے۔)

یہ کتاب صرف آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری کی بھرپور دفاع کیوں فراہم کرتی ہے؟ کیونکہ مارکیٹ میں سینکڑوں، بلکہ ہزاروں کتابیں ہیں جو "متوازن" بحثیں فراہم کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں، لیکن دراصل ان میں دولت کی تخلیق، کاروباری صلاحیت، جدت طرازی، نفع و نقصان کے نظام، اور عام طور پر آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری کے خلاف الزامات ہی ہوتے ہیں۔ اپنے کیریئر کے دوران میں نے سینکڑوں کتابیں پڑھی ہیں جو آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری کے خلاف تھیں؛ میں نے ان دلائل پر غور کیا اور ان سے نبرد آزما ہوا۔ اس کے برعکس آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری کے نقادوں کو تلاش کرنا غیر معمولی کام ہے جو ایک ایسے مصنف کو پڑھ چکے ہوں جس نے آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری کے دفاع کی ہمت کی ہو۔ جدید اینگلو سیکسن ادبی دنیا میں وہ مصنف جس کا سب سے زیادہ حوالہ دیا جاتا ہے وہ روبرٹ نوزک ہیں، اور یہاں تک کہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسکی کتاب کا صرف ایک باب پڑھا گیا تھا، وہ جس میں اس نے آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری کے مخالفین کو چیلنج کرنے کے لیے ایک مفروضہ پیش کیا تھا۔ زیادہ تر سوشلسٹ سمجھتے ہیں کہ ایک مضمون پڑھنا اور ایک مفروضے کو رد کرنا کافی ہے۔ ایک دلیل پڑھنے اور رد کرنے کے بعد، اگر آزاد مارکیٹ کی سرمایہ داری کو بدنام کرنے والے ایسے نقاد اس تنقید کو جاری رکھنے کے قابل سمجھتے بھی ہیں، تو وہ اکثر ملٹن فریڈمین، آئن رینڈ،

ایف. اے ہائیک، یا ایڈم سمتھ کے خیالات کی غلط بیانی یا بگاڑی ہوئی ورژن پر انحصار کرتے ہیں، جو بغیر حوالہ کے پیش کئے جاتے ہیں۔

ایک حالیہ نمایاں مثال کے طور پر، ہارورڈ کے پروفیسر مائیکل سینڈل نے اپنی کتاب **"جسٹس: واٹس دی رائٹ تھنگ ٹو ڈو؟"**(Justice: What's the Right Thing to Do?) میں آزاد منڈی کی سرمایہ داری کے حق میں دلائل کے خلاف بحث پیش کی ہے۔ نوزک کے علاوہ، انہوں نے فریڈمین اور ہائیک کا حوالہ دیا، لیکن واضح کیا کہ انہوں نے ان کی کتابیں نہیں پڑھی ہیں۔ انہوں نے فریڈمین کے اس سوال کا حوالہ دیا: "کیا ہمیں یہ حق ہے کہ ہم کسی کو [جو ریٹائرمنٹ کے لیے بچت نہیں کرے گا] جبراًوہ کرنے سے روکیں جو وہ کرنا چاہتا ہے؟" تاہم، سینڈل یہ نوٹ کرنے میں ناکام رہے کہ اگلے ہی پیراگراف میں، فریڈمین نے ایسے جبر کے لیے وجوہات پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ "اس دلیل کا وزن واضح طور پر حقیقت پر منحصر ہے۔" (فریڈمین کلاسیکی لبرل اصول "آزادی کی ترجیح" کا حوالہ دے رہے تھے، حقوق کے بارے میں کوئی حتمی بیان نہیں دے رہے تھے، جیسا کہ سینڈل غلط طور پر دعویٰ کرتے ہیں۔)

سینڈل یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ "دی کانسٹیٹیوشن آف لبرٹی (1960) میں، آسٹریا میں پیدا ہونے والے اقتصادی ماہر، فلسفی فریڈریک اے. ہائیک (1899-1992) نے دلیل دی کہ 'زیادہ اقتصادی مساوات لانے کی کسی بھی کوشش کو جبری اور آزاد معاشرے کے لیے تباہ کن ہونا چاہیے'"- جو کہ ہائیک نے حقیقت میں نہیں کہا ہے؛ وہ دلیل دیتے ہیں کہ "ترقی پذیر انکم ٹیکسیشن" (جس میں آمدنی کے ساتھ ٹیکس کی شرح بڑھتی ہے) قانون کی حکمرانی سے

مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ "تناسب کی مانند، ترقی کوئی اصول فراہم نہیں کرتی جو ہمیں بتائے کہ مختلف افراد کے بوجھ کا تناسب کیا ہونا چاہیے،" لیکن یہ اس کے مترادف نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ رہے ہوں کہ اقتصادی مساوات لانے کی کسی بھی کوشش (مثلاً، امیروں کے لیے خصوصی سبسڈیز اور مراعات ختم کرکے) کو جبری ہونا چاہیے۔ (سینڈل کا غلط دعویٰ اور ان کا بیان ظاہر کرتے ہیں کہ سینڈل نے ہائیک کی کتاب کو دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی؛ کوئی یہ سوچ سکتا ہے کہ آیا وہ ایڈم اسمتھ کی "انکوائری انٹو دی نیچر اینڈ کازز آف دی ویلتھ آف نیشنز" کو بھی پن بنانے کے طریقہ کار کی کتاب کے طور پر بیان کریں گے۔)

سنجیدہ لوگوں کو بہتر کام کرنا چاہیے۔ میں اس مضمون اور کتاب کے قارئین کو سختی سے مشورہ دیتا ہوں کہ وہ بہتر کریں۔ آزاد منڈی کی سرمایہ داری کے بہترین ناقدین کو پڑھیں۔ مارکس کو پڑھیں، سومبارٹ کو پڑھیں، راولز کو پڑھیں، سینڈل کو پڑھیں۔ ان کو سمجھیں۔ ان سے قائل ہونے کے لیے کھلے دل سے غور کریں۔ ان کے بارے میں سوچیں۔ میں نے آزاد منڈی کی سرمایہ داری کے خلاف زیادہ دلائل پڑھے ہیں جتنا کہ اس کے اکثر مخالفین نے پڑھے ہوں گے، اور میرا خیال ہے کہ میں ان کے کیس کو اکثر ان سے بہتر پیش کر سکتا ہوں کیونکہ میں اسے بہتر جانتا ہوں۔ یہاں اس بحث کا دوسرا رخ پیش کیا گیا ہے، وہ رخ جسے شاذ و نادر ہی تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ موجود ہے۔ تو آگے بڑھیں، ایک موقع لیں۔ اس کتاب کے مضامین میں پیش کردہ دلائل سے نبرد آزما ہوں۔ ان پر غور کریں، پھر خود فیصلہ کریں۔

—ٹام جی. پالمر واشنگٹن، ڈی. سی.

باب نمبر 1
کاروباری سرمایہ داری
کی خوبیاں

ایک کاروباری شخص جان میکی کے ساتھ انٹرویو

انٹرویو کرنے والے: ٹام جی. پالمر

اس انٹرویو میں، کاروباری شخصیت اور ہول فوڈز کے شریک بانی اور شریک چیف ایگزیکٹو جان میکی اپنی "شعوری سرمایہ داری" کے فلسفے کی وضاحت کرتے ہیں اور انسانی فطرت اور تحریک، کاروبار کی نوعیت، اور آزاد منڈی کی سرمایہ داری اور "کرونی سرمایہ داری" کے درمیان فرق کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ جان میکی نے 1980 میں ہول فوڈز مارکیٹ کی مشترکہ بنیاد رکھی۔ وہ صحت مند غذا، جانوروں کے اخلاقی سلوک، اور کاروباروں کے ذریعہ مثبت کمیونٹی شمولیت کو فروغ دینے میں ایک رہنما رہے ہیں۔ وہ شعوری سرمایہ داری انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی ہیں۔

پالمر: جان، آپ کاروباری دنیا میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں: ایک ایسے کاروباری جو سرمایہ داری کی اخلاقیات کا بے جھجک دفاع کرتے ہیں۔ آپ یہ کہنے کے لیے بھی مشہور ہیں کہ خود غرضی سرمایہ داری کے لیے کافی نہیں ہے۔ آپ اس سے کیا مطلب لیتے ہیں؟

میکی: صرف خود غرضی پر انحصار کرنا انسانی فطرت کے بارے میں ایک بہت ہی نامکمل نظریے پر انحصار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ مجھے کالج میں ان مباحثوں کی یاد دلاتا ہے جہاں لوگ یہ دلیل دینے کی کوشش کرتے تھے کہ آپ جو کچھ بھی کرتے ہیں، وہ منطقی طور پر خود غرضی سے آتا ہے ورنہ آپ اسے نہیں کرتے۔ یہ ایک ناقابل تردید موقف ہے اور آخرکار بے معنی ہے، کیونکہ اگر آپ کوئی ایسی چیز بھی کرتے ہیں جو آپ کی خود غرضی میں شامل

نہیں ہے، تو وہ پھر بھی کہیں گے کہ یہ آپ کی خود غرضی میں شامل تھا ورنہ آپ یہ نہیں کرتے۔ لہذا، یہ ایک دائرے کی بحث ہے۔

پالمر : آپ کے خیال میں خود غرضی کے علاوہ دیگر محرکات کس طرح سرمایہ داری کے لیے اہم ہیں؟

میکی : مجھے یہ سوال پسند نہیں ہے، کیونکہ لوگ خود غرضی کی مختلف تعریفیں کرتے ہیں، اور آپ اکثر اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ایک دوسرے سے متفق نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ میں نے کالج کی ان مباحثوں کا ذکر کیا جہاں ہر چیز کو خود غرضی سمجھا جاتا ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ انسان پیچیدہ ہیں اور ہماری کئی محرکات ہیں، جن میں سے خود غرضی ایک ہے، لیکن یہ واحد محرک نہیں ہے۔ ہم بہت سی ایسی چیزوں سے متاثر ہوتے ہیں جن کی ہمیں پرواہ ہوتی ہے، اور یہ چیزیں ہماری خود غرضی تک محدود نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کسی نہ کسی طرح آزادی تحریک شاید آئن رینڈ اور بہت سے ماہرین اقتصادیات کے مشترکہ اثر ورسوخ کی وجہ سے ایک نظریاتی بند گلی میں پہنچ چکی ہے جو میرے خیال میں کاروبار، سرمایہ داری، یا انسانی فطرت کے ساتھ انصاف نہیں کرتی۔

اگر آپ اس پر غور کریں، تو ہماری زندگی کا وہ وقت جب ہم شاید سب سے زیادہ خود غرض ہوتے ہیں، وہ وقت ہوتا ہے جب ہم جوان اور جذباتی طور پر نابالغ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر بچے اور نوجوان حد سے زیادہ خود غرض یا خود پسند ہوتے ہیں۔ وہ اپنی سمجھ کے مطابق اپنے مفادات کے مطابق عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے ہم بڑے اور بالغ ہوتے ہیں، ہم ہمدردی، رحم، محبت اور انسانی جذبات کی مکمل رینج کے قابل ہو جاتے ہیں۔ لوگ بہت سی

وجوہات کی بنا پر کام کرتے ہیں۔ اکثر خود غرضی، خود پسندی، اور ایثار کے درمیان ایک غلط دوہرے پن کا تصور قائم کیا جاتا ہے۔ میرے لیے، یہ ایک غلط دوہراپن ہے کیونکہ ہم واضح طور پر دونوں ہیں۔ ہم خود غرض ہیں، لیکن ہم صرف خود غرض نہیں ہیں۔ ہم دوسرے لوگوں کی بھی پرواہ کرتے ہیں۔ ہمیں عام طور پر اپنے خاندان کی بھلائی کی بہت فکر ہوتی ہے۔ ہمیں عموماً اپنے کمیونٹیز اور اس بڑے معاشرے کی بھی پرواہ ہوتی ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ ہم جانوروں کی بھلائی اور اپنے بڑے ماحول کی بھی فکر کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے نظریات ہیں جو ہمیں دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کرنے کے لیے متحرک کرتے ہیں۔ ایک سخت تعریف کے مطابق، یہ خود غرضی کی نفی کرتے نظر آئیں گے، جب تک کہ آپ دوبارہ اس دائرے کی دلیل میں واپس نہ آجائیں کہ جو کچھ بھی آپ کی پرواہ ہوتی ہے اور جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں وہ خود غرضی ہے۔

اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ خود غرضی کافی ہے۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ ہر عمل کو خود غرض کہنے کا نظریہ انسانی فطرت کے لیے اچھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سرمایہ داری اور کاروبار کو انسانی فطرت کی پیچیدگی کو مکمل طور پر عکاسی کرنی چاہیے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ کاروبار اور سرمایہ داری کے "برانڈز" کو بہت زیادہ نقصان پہنچاتا ہے کیونکہ یہ سرمایہ داری اور کاروبار کے دشمنوں کو انہیں خود غرض، لالچی اور استحصال کرنے والے کے طور پر پیش کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ واقعی مجھے پریشان کرتا ہے، ٹام، کیونکہ سرمایہ داری اور کاروباری دنیا میں سب سے بڑی بھلائی کی قوتیں ہیں۔ کم از کم پچھلے تین سو سالوں سے یہ اسی طرح ہے... اور انہیں اس حیرت انگیز قدر کا مناسب کریڈٹ نہیں ملتا جو انہوں نے پیدا کی ہے۔

پالمر: خود غرضی یا منافع کے حصول کے علاوہ، ایک کاروبار اور کیا کرتا ہے؟

میکی : عام طور پر کہا جائے تو کامیاب کاروبار قدر پیدا کرتے ہیں۔ سرمایہ داری کی خوبصورتی یہ ہے کہ یہ بالآخر باہمی فائدے کے لیے رضاکارانہ تبادلے پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر، ہول فوڈز مارکیٹ جیسے کاروبار کو لیں، ہم اپنے گاہکوں کے لیے ان کی فراہم کردہ اشیاء اور خدمات کے ذریعے قدر پیدا کرتے ہیں۔ انہیں ہمارے ساتھ تجارت کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ وہ ایسا اس لیے کرتے ہیں کیونکہ وہ چاہتے ہیں، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ایسا کرنا ان کے مفاد میں ہے۔ لہذا، ہم ان کے لیے قدر پیدا کر رہے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے لیے بھی قدر پیدا کرتے ہیں جو ہمارے لیے کام کرتے ہیں جیسے ہمارے ٹیم ممبران۔ ان میں سے کوئی بھی غلام نہیں ہے۔ وہ سب رضاکارانہ طور پر کام کر رہے ہیں کیونکہ انہیں لگتا ہے کہ یہ وہ نوکری ہے جو وہ کرنا چاہتے ہیں؛ تنخواہ ان کے لیے اطمینان بخش ہے؛ انہیں ہول فوڈز میں کام کرنے سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں، نفسیاتی اور مالی دونوں لحاظ سے۔ لہذا، ہم ان کے لیے قدر پیدا کر رہے ہیں۔ ہم اپنے سرمایہ کاروں کے لیے قدر پیدا کر رہے ہیں، کیونکہ، ہماری مارکیٹ کیپ 10 بلین ڈالر سے زیادہ ہے اور ہم نے کچھ بھی نہیں سے آغاز کیا! تو ہم نے پچھلے تیس سالوں میں اپنے سرمایہ کاروں کے لیے 10 بلین ڈالر سے زیادہ کی قدر پیدا کی ہے۔ ہمارے کوئی بھی سٹاک ہولڈر ہمارے سٹاک کو رکھنے پر مجبور نہیں ہیں۔ وہ سب رضاکارانہ طور پر ایسا کرتے ہیں کیونکہ ان کا یقین ہے کہ ہم ان کے لیے قدر پیدا کر رہے ہیں۔ ہم اپنے سپلائرز کے لیے بھی قدر پیدا کر رہے ہیں، جو ہمارے کاروبار کے ساتھ تجارت کرتے ہیں۔ میں نے ان کو سالوں کے دوران دیکھا ہے، ان کے کاروبار کو بڑھتے دیکھا ہے، انہیں ترقی کرتے دیکھا ہے —اور یہ سب رضاکارانہ طور پر ہوا ہے۔ وہ ہول فوڈز کو بہتر بنانے میں مدد کرتے ہیں اور ہم ان کو بہتر بنانے میں مدد کرتے ہیں۔

پالمر : آپ اپنے فلسفے کو "شعوری سرمایہ داری" کا نام دیتے ہیں۔ اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

میکی : ہم اس اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں تا کہ ان دیگر تمام اصطلاحات سے فرق پیدا کیا جا سکے جو کہ ایک ساتھ مل کر کافی الجھن پیدا کرتی ہیں، جیسے "کارپوریٹ سماجی ذمہ داری"، یا بل گیٹس کی "تخلیقی سرمایہ داری"، یا "پائیدار سرمایہ داری"۔ ہمارے پاس شعوری سرمایہ داری کی ایک بہت واضح تعریف ہے، جو چار اصولوں پر مبنی ہے۔

پہلا اصول یہ ہے کہ کاروبار میں ایک اعلیٰ مقصد کا امکان ہوتا ہے جو کہ پیسہ کمانے کو شامل کر سکتا ہے لیکن اس تک محدود نہیں ہوتا۔ لہذا ہر کاروبار میں ایک اعلیٰ مقصد کا امکان ہوتا ہے۔ اور اگر آپ اس پر غور کریں، تو ہمارے معاشرے میں دیگر تمام پیشے مقصد کے تحت متحرک ہوتے ہیں، جس کا مطلب صرف منافع کو زیادہ سے زیادہ کرنا نہیں ہوتا۔ ہمارے معاشرے میں ڈاکٹروں کا شمار سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے افراد میں ہوتا ہے اور پھر بھی ڈاکٹروں کا مقصد لوگوں کا علاج کرنا ہوتا ہے، اور یہی پیشہ ورانہ اخلاقیات میڈیکل اسکول میں سکھائی جاتی ہیں۔ یہ نہیں کہا جا رہا کہ کوئی لالچی ڈاکٹر نہیں ہے، لیکن کم از کم جن ڈاکٹروں کو میں جانتا ہوں، وہ واقعی اپنے مریضوں کی پرواہ کرتے ہیں اور جب وہ بیمار ہوتے ہیں تو انہیں شفا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اساتذہ لوگوں کو تعلیم دینے کی کوشش کرتے ہیں، معمار عمارتوں کا ڈیزائن کرتے ہیں، اور وکلا (جب آپ وکلا کے تمام لطیفوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں) ہمارے معاشرے میں انصاف اور عدل و انصاف کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر پیشے کا ایک مقصد ہوتا ہے جو منافع کو زیادہ سے زیادہ کرنے سے آگے ہوتا ہے، اور کاروبار کا بھی یہی حال

ہے۔ ہول فوڈز ایک گروسری اسٹور ہے، لہٰذا ہم لوگوں کے لیے اعلیٰ معیار کی قدرتی اور نامیاتی (آرگینک) غذا فروخت کرتے ہیں اور انہیں صحت مند اور لمبی زندگی گزارنے میں مدد کرتے ہیں۔

پالمر: اور دوسرا اصول؟

میکی: شعوری سرمایہ داری کا دوسرا اصول سٹیک ہولڈر اصول ہے، جس کا میں نے پہلے ذکر کیا تھا، جو یہ ہے کہ آپ کو ان مختلف سٹیک ہولڈرز کے بارے میں سوچنا چاہیے جن کے لیے ایک کاروبار قدر پیدا کرتا ہے اور جو کاروبار پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ آپ کو اپنے کاروبار کی پیچیدگیوں پر غور کرنا چاہیے تاکہ ان تمام باہمی انحصار کرنے والے اسٹیک ہولڈرز جیسے گاہکوں، ملازمین، سپلائرز، سرمایہ کاروں، اور کمیونٹیز کے لیے قدر پیدا کی جاسکے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ ایک کاروبار کو ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو انتہائی اخلاقی ہوں اور جو کاروبار کے مقصد کو اولین ترجیح دیں۔ وہ اس مقصد کی خدمت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ سٹیک ہولڈر اصول پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں کاروبار کی باتوں پر عمل کرنا پڑتا ہے۔

اور شعوری سرمایہ داری کا چوتھا اصول یہ ہے کہ آپ کو ایسی ثقافت تخلیق کرنی ہوگی جو مقصد، سٹیک ہولڈرز اور قیادت کی حمایت کرتی ہو، تاکہ یہ سب مل کر ایک مکمل تصویر بنائے۔

پالمر : کیا یہ اصول آپ کو ذاتی طور پر صبح اٹھنے پر متحرک کرتے ہیں؟ کیا آپ کہتے ہیں، "میں آج ایک اور ڈالر کمانے جا رہا ہوں" یا "میں اپنے بنیادی اصولوں کے ساتھ وفادار رہنے جا رہا ہوں"؟

میکی : میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں میں تھوڑا سا مختلف ہوں کیونکہ میں نے تقریباً پانچ سال سے ہول فوڈز سے کوئی تنخواہ یا بونس نہیں لیا ہے۔ سٹاک آپشنز، جن کا میں حقدار ہوں، ہول پلینٹ فاؤنڈیشن (The Whole Planet Foundation) کو دیئے جاتے ہیں تاکہ دنیا بھر کے غریب لوگوں کو مائیکرو کریڈٹ قرضے فراہم کیے جا سکیں۔ میں ہول فوڈز کے مقصد سے بہت زیادہ متحرک ہوتا ہوں، اس سے زیادہ کہ میں کاروبار سے کتنی رقم معاوضے کے طور پر نکال سکتا ہوں، میرا یقین ہے کہ میرے پاس ذاتی طور پر کمپنی میں موجود اسٹاک سے کافی دولت ہے۔

پالمر : اور، ایک بار پھر، آپ اس مقصد کو کیسے بیان کرتے ہیں؟

میکی : ہول فوڈز کا مقصد... اگر ہمارے پاس زیادہ وقت ہوتا تو ہم ہول فوڈز کے اعلیٰ مقصد کے بارے میں تفصیل سے بات کر سکتے تھے۔ میں نے تقریباً دو ہفتے پہلے ہماری لیڈر شپ گروپ کو لیکچر دیا تھا۔ جو میں ایک منٹ میں کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری کمپنی سات بنیادی اقدار کے گرد منظم ہے۔ ہماری پہلی بنیادی قدر ہے اپنے صارفین کو مطمئن کرنا اور ان کی خوشی کو بڑھانا۔ ہماری دوسری بنیادی قدر ٹیم ممبروں کی خوشی اور بہترین کارکردگی ہے۔ (یہ سب کچھ ہمارے ویب سائٹ پر موجود ہے، اس لیے ہم اسے کافی عام کرتے ہیں۔) ہماری تیسری بنیادی قدر منافع اور ترقی کے ذریعے دولت پیدا کرنا ہے۔ چوتھی بنیادی قدر ان کمیونٹیز میں

اچھے شہری بننا ہے جہاں ہم کاروبار کرتے ہیں۔ پانچویں بنیادی قدر یہ ہے کہ ہم اپنے کاروبار کو ماحولیاتی دیانتداری کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کریں۔ چھٹی بنیادی قدر یہ ہے کہ ہم اپنے سپلائرز کو شراکت دار کے طور پر دیکھتے ہیں اور ہم ان کے ساتھ جیتنے والے تعلقات میں مشغول ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ساتویں بنیادی قدر یہ ہے کہ ہم اپنے تمام سٹیک ہولڈرز کو صحت مند طرز زندگی اور صحت مند غذا کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا، ہمارے اعلیٰ مقاصد ان بنیادی اقدار کی براہ راست توسیع ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں جیسے: امریکہ کو صحت مند بنانے کی کوشش؛ ہمارے ملک کے لوگ موٹے اور بیمار ہیں، ہم خطرناک خوراک کھاتے ہیں اور دل کی بیماری، کینسر، اور ذیابیطس سے مر جاتے ہیں۔ یہ طرز زندگی کی بیماریاں ہیں - یہ بڑی حد تک قابل اجتناب یا قابل واپسی بیماریاں ہیں، اس لیے یہ ہمارے اعلیٰ مقاصد میں سے ایک ہے۔ ہمارا ایک اعلیٰ مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اپنے زرعی نظام کو زیادہ پائیدار بنانے کیلئے کوشش کرے جو کہ اعلیٰ درجے کی پیداواریت بھی رکھتا ہو۔

تیسرا اعلیٰ مقصد ہمارے ہول پلینٹ فاؤنڈیشن(The Whole Planet Foundation) سے منسلک ہے، جو گرامین ٹرسٹ اور دیگر مائیکرو کریڈٹ تنظیموں[ایڈیٹر کا نوٹ: گرامین بینک اور گرامین ٹرسٹ غریب ممالک میں، خاص طور پر خواتین کو ترقی کے راستے پر لانے کیلئے مائیکرو فنانس کو فروغ دیتے ہیں] کے ساتھ مل کر عالمی سطح پر غربت کے خاتمے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم اب 34 ممالک میں ہیں - دو سال میں یہ 56 ہو جائیں گے - اور اس کا پہلے ہی لاکھوں لوگوں پر مثبت اثر پڑ رہا ہے۔ ہمارا چوتھا اعلیٰ مقصد شعوری سرمایہ داری کا فروغ ہے۔

پالمر: آپ نے کاروبار کے مقاصد کے بارے میں بات کی ہے، تو... منافع کیوں حاصل کرنا

ضروری ہے؟ کیا کاروبار منافع کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی ایک سرگرمی نہیں ہے؟ کیا آپ یہ سب کچھ بغیر منافع کے نہیں کر سکتے؟ کیا آپ صرف اتنی رقم نہیں کما سکتے جو آپ کے اخراجات کو پورا کر سکے؟

میکی : ایک جواب یہ ہے کہ اگر آپ صرف اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کافی رقم کما رہے ہیں، تو آپ کی تاثیر بہت محدود ہو جائے گی۔ آج ہول فوڈز کا اثر تیس، بیس، پندرہ یا دس سال پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ ہم بہت منافع بخش رہے ہیں، ہم ترقی کرنے اور اپنے مقاصد کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں، ہم لاکھوں لوگوں تک پہنچنے اور ان کی مدد کرنے کے قابل ہو گئے ہیں، بجائے اس کے کہ ہم صرف چند ہزار لوگوں کی مدد کریں۔ تو میرا خیال ہے کہ منافع اپنے مقصد کو بہتر طریقے سے پورا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ، منافع پیدا کرنے سے وہ سرمایہ فراہم ہوتا ہے جس کی ہمارے دنیا کو جدت اور ترقی کے لیے ضرورت ہے، کوئی منافع نہیں، تو کوئی ترقی نہیں۔ ان کا ایک دوسرے پر مکمل باہمی انحصار ہوتا ہے۔

پالمر : لیکن اگر منافع آپ کے شیئر ہولڈرز کی جیبوں میں جا رہا ہے، تو کیا یہ مشن کو اتنی حد تک پورا کر رہا ہے جتنا کہ اسے کر سکتا تھا؟

میکی : ظاہر ہے، ہمارے زیادہ تر منافع ہمارے شیئر ہولڈرز کی جیبوں میں نہیں جاتا۔ صرف وہ نسبتاً چھوٹا حصہ جو ہم منافع میں دیتے ہیں، جاتا ہے۔ جو رقم ہم نے کمائی ہے اس کا نوے فیصد سے زیادہ کاروبار کی ترقی کے لیے دوبارہ سرمایہ کاری میں لگا دیا گیا ہے۔ سختی سے بات کریں تو اگر ہم اپنے منافع کا سو فیصد منافع کے طور پر ادا کریں تو یہ درست ہو گا، لیکن مجھے کسی

بھی کاروبار سوائے REIT (ریئل اسٹیٹ انویسٹمنٹ ٹرسٹ) کے بارے میں علم نہیں ہے جو یہ کرتا ہو۔ باقی سب لوگ ترقی کے لیے دوبارہ سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ مزید بر آں، شیئر ہولڈرز کے لیے منافع انہیں سب سے پہلے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جس کے بغیر آپ کے پاس اپنے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے بالکل بھی سرمایہ نہ ہوتا۔ کسی فرم کی سرمائے کی قیمت یا قدر میں اضافہ کرنے کی صلاحیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ قدر پیدا کرنے کے قابل ہیں اور اس کی ایک اچھی پیمائش آپ کے شیئر یا حصص کی قیمت ہے۔ یہی میرا مطلب تھا جب میں نے کہا کہ ہم نے گزشتہ تیس سالوں میں 10 بلین ڈالر سے زیادہ کی مالیت پیدا کی ہے۔

پالمر: لوگ کبھی کبھار کہتے ہیں کہ آزاد منڈیاں عدم مساوات پیدا کرتی ہیں، آپ اس دعوے کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

میکی: میرا نہیں خیال کہ یہ سچ ہے۔ انتہا درجے کی غربت زیادہ تر لوگوں کے لیے پوری تاریخ میں ایک عام انسانی حالت رہی ہے۔ انسانیت کے تمام افراد یکساں غریب تھے اور نسبتاً مختصر زندگی گزار رہے تھے۔ آج کے دور میں دو سو سال پہلے، زمین پر موجود 85 فیصد لوگ ایک ڈالر سے کم یومیہ آمدنی پر گزارہ کرتے تھے—85 فیصد! یہ تعداد اب صرف 20 فیصد رہ گئی ہے اور اس صدی کے آخر تک، یہ عملی طور پر صفر ہو جانی چاہیے۔ تو یہ بڑھتی ہوئی لہر ہے۔ دنیا امیر ہوتی جارہی ہے۔ لوگ غربت سے نکل رہے ہیں۔ انسانیت واقعی ترقی کر رہی ہے۔ ہماری ثقافت ترقی کر رہی ہے۔ ہماری ذہانت بڑھ رہی ہے۔ ہم اوپر کی طرف جارہے ہیں، اگر ہم خود کو تباہ کرنے میں کامیاب نہ ہو گئے، جو کہ یقینا ایک خطرہ ہے، کیونکہ لوگ بعض

اوقات جنگجویانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اور یہ ویسے ان وجوہات میں سے ایک ہے کہ ہمیں کاروبار اور صنعت کو فروغ دینے اور دولت کی تخلیق کے لیے کام کرنا چاہیے، کیونکہ یہ عسکریت پسندی، سیاسی تنازع، اور دولت کی تباہی کے مقابلے میں توانائی کے لیے ایک صحت مند راستہ ہے۔ لیکن یہ ایک اور بڑا موضوع ہے۔

تو کیا اس سے عدم مساوات میں اضافہ ہوتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ سرمایہ داری عدم مساوات پیدا نہیں کرتی، بلکہ یہ لوگوں کو زیادہ خوشحال ہونے میں مدد دیتی ہے، اور لازمی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر کوئی ایک ہی رفتار سے نہیں بڑھے گا، لیکن بالآخر ہر کوئی وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا ہے۔ ہم نے یہ خاص طور پر پچھلے بیس سالوں میں دیکھا ہے کیونکہ ہم نے چین اور بھارت میں سینکڑوں لاکھوں لوگوں کو غربت سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہے کیونکہ انہوں نے زیادہ سرمایہ داری کو اپنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کے مقابلے میں جلدی غربت سے نکل کر خوشحال ہو رہے ہیں۔ اب، یہ غربت پیدا نہیں کر رہا، یہ غربت کا خاتمہ کر رہا ہے۔ یہ عدم مساوات کا باعث نہیں ہے جیسا کہ زیادہ تر لوگ اس اصطلاح کے بارے میں سوچتے ہیں۔ پوری تاریخ میں کسی بھی قسم کے سماجی تنظیم میں ہمیشہ سے عدم مساوات رہی ہے۔ حتیٰ کہ کمیونزم، جو کہ دولت کی مساوی ملکیت پیدا کرنے والے معاشرے کی تخلیق کرنے کا دعویٰ کرتی تھی، شدید طور پر تقسیم شدہ تھی اور اس میں ایسے افراد شامل تھے جو خاص مراعات رکھتے تھے۔ لہذا، میں یہ نہیں دیکھتا کہ عدم مساوات کا الزام سرمایہ داری پر لگایا جانا چاہیے۔ سرمایہ داری لوگوں کو غربت سے نکلنے اور زیادہ خوشحال اور امیر ہونے کے قابل بناتی ہے اور یہ بہت اچھا ہے۔ ہمیں اسی مسئلے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

دنیامیں بڑافرق ان ممالک کے درمیان ہے جنہوں نے آزاد منڈی کی سرمایہ داری کو اپنایا اور امیر ہوئے، اور جنہوں نے ایسا نہیں کیا اور غریب رہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کچھ امیر ہو گئے، بلکہ یہ کہ دوسرے غریب رہے۔ اور ایسا نہیں ہونا چاہیے!

پالمر : آپ نے آزاد منڈی کی سرمایہ داری کو دوسرے نظاموں سے ممتاز کیا ہے جہاں لوگ بھی منافع کماتے ہیں اور کاروبار کرتے ہیں، لیکن انہیں اکثر "کرونی سرمایہ داری" کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ آپ کے اخلاقی وژن اور دنیا کے بہت سے ممالک میں موجود نظام کے درمیان کیا فرق ہے؟

میکی : قانون کی حکمرانی ہونی چاہیے، لوگوں کے لیے یکساں قوانین ہونے چاہئیں جو سب پر برابر لاگو ہوں، اور انہیں انصاف کے نظام کے ذریعے نافذ کیا جانا چاہیے جس کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہو۔ قانون کا سب کے لیے یکساں اطلاق بنیادی مقصد ہونا چاہیے، کسی کو خاص مراعات نہ ملیں۔ تو جو کچھ بہت سے معاشروں میں ہو رہا ہے، اور جو میرے خیال میں امریکہ میں بھی بڑھتا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو خاص مراعات دی جاتی ہیں جو سیاسی روابط رکھتے ہیں، یہ غلط ہے، یہ بری بات ہے۔ جس حد تک کوئی بھی معاشرہ کرونی سرمایہ داری یا جیسا کہ میرے دوست مائیکل اسٹرونگ کہتے ہیں "کرپٹلزم" سے متاثر ہے، آپ اب آزاد منڈی کے معاشرے میں نہیں ہیں اور آپ خوشحالی کو بہتر طریقے سے استعمال نہیں کر رہے ہیں؛ آپ غیر ضروری طور پر بہت سارے لوگوں کو کم خوشحال رکھ رہے ہیں، جتنا کہ وہ ہوتے اگر آپ کے پاس واقعی ایک آزاد منڈی کا نظام ہوتا جس کی حمایت قانون کی حکمرانی کرتی۔

پالمر : آیئے اس ملک کی طرف رخ کریں جس میں آپ رہتے ہیں، یعنی امریکہ۔ کیا آپ کو لگتا

ہے کہ امریکہ میں کوئی کرونی ازم ہے؟

میکی : میں آپکو اپنا پسندیدہ موجودہ مثال دیتا ہوں، اصل میں، میرے پاس دو ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اوباما انتظامیہ نے اپنے قوانین اور ضوابط کے لیے جو اوباما کیئر کے تحت منظور کیے گئے تھے، اب تک ہزار سے زیادہ چھوٹ دے دی ہیں۔ یہ ایک شکل کی کرونی سرمایہ داری ہے۔ قوانین سب پر یکساں لاگو نہیں ہو رہے ہیں۔ اور اس کا مطلب ہے کہ چھوٹ دینے کی طاقت کا مطلب یہ بھی ہے کہ کسی کو چھوٹ نہ دی جائے۔ اور آپ انہیں ان لوگوں کو انکار کر سکتے ہیں جو برسر اقتدار سیاسی پارٹی کو مناسب عطیات نہیں دے رہے ہیں یا جو آپ کو، کسی بھی وجہ سے ناپسند ہیں۔ آپ کے پاس ایک ایسا من مانا قانون ہے جو آپ کچھ پر لاگو کر سکتے ہیں اور دوسروں پر نہیں۔

دوسرا، میں ابھی ان تمام سبسڈیز میں کرونی کیپٹلزم دیکھ رہا ہوں جو مثال کے طور پر "گرین ٹیکنالوجی" میں جا رہی ہیں۔ وہ کچھ کاروباروں کو سبسڈی دے رہے ہیں اور بالآخر، چونکہ حکومت کے پاس اپنے طور پر کوئی پیسہ نہیں ہے، اس لیے وہ اسے ٹیکس دہندگان سے لے کر سیاسی طور پر پسندیدہ لوگوں میں تقسیم کر رہی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جنرل الیکٹرک کے ساتھ اب کیا ہو رہا ہے، وہ کس قسم کے ٹیکسوں کی ادائیگی کر رہے ہیں، ان سب خصوصی چھوٹوں اور کٹوتیوں کے ساتھ جو ٹیکس قوانین میں شامل ہیں اور چونکہ وہ ان متبادل توانائی کی ٹیکنالوجیوں میں بہت زیادہ سرمایہ کاری کر رہے ہیں یا کچھ میں، وہ اس مقام پر پہنچ رہے ہیں جہاں انہیں اپنی زیادہ تر آمدنی پر ٹیکس ادا نہیں کرنی پڑتی، صرف اس لیے کہ انکے سیاسی تعلقات ہیں۔ تو یہ مجھے برا لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بری بات ہے۔

پالمر: کیا آپ اسے غیر اخلاقی کہیں گے؟

میکی: ہاں، میں کہوں گا، غیر اخلاقی... میں اسے غیر اخلاقی کہتا ہوں۔ لیکن پھر آپ کو یہ وضاحت کرنی پڑے گی کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ یہ یقینی طور پر میری اخلاقیات اور میرے صحیح و غلط کے احساس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا یہ دوسروں کی اخلاقیات کی خلاف ورزی کرتا ہے یا نہیں۔ میں یقینی طور پر اسے پسند نہیں کرتا۔ میں اس کے خلاف ہوں۔ یہ میری نظر میں اس بات سے مطابقت نہیں رکھتا کہ معاشرے کو کیسے چلایا جانا چاہیے۔ ایسے واقعات اس معاشرے میں نہیں ہونے چاہئیں جس میں قانون کی حکمرانی مضبوط ہو۔

پالمر: آپ کی نظر میں آزاد منڈی کی سرمایہ داری سے کون سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے جسے آپ پسند کرتے ہیں؟

میکی: ہر کوئی! معاشرے میں ہر کوئی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ وہی ہے جس نے انسانیت کی ایک بڑی تعداد کو غربت سے نکالا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اس ملک کو امیر بنایا ہے۔ ہم بہت غریب تھے۔ امریکہ مواقع کی سرزمین تھا، لیکن یہ امیر ملک نہیں تھا۔ اگرچہ امریکہ یقیناً کامل نہیں رہا، اس نے تقریباً دو سو سال تک دنیا کی سب سے آزاد منڈیوں میں سے ایک کا لطف اٹھایا ہے، اور اس کے نتیجے میں ہم ایک غریب ملک سے ایک خوشحال، حقیقی معنوں میں امیر ملک بن گئے ہیں۔

پالمر: ڈیرڈری میک کلوسکی نے اپنی کتاب "Bourgeois Dignity" میں دلیل دی ہے کہ

یہ لوگوں کے کاروبار اور کاروباری جدت طرازی کے بارے میں سوچنے کے انداز میں تبدیلی تھی جس نے عام لوگوں کے لیے خوشحالی کو ممکن بنایا۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ ہم دولت پیدا کرنے والے کاروباروں کے لیے دوبارہ وہ احترام حاصل کر سکتے ہیں؟

میکی : میرا خیال ہے کہ ہم کر سکتے ہیں کیونکہ میں نے دیکھا کہ جب رونالڈ ریگن منتخب ہوئے تو کیا ہوا۔ 1970 کی دہائی میں امریکہ زوال پذیر تھا—اس میں کوئی شک نہیں؛ دیکھیں ہماری افراط زر کی شرح کیا تھی، سود کی شرح کہاں تھیں، جی ڈی پی کس سمت جا رہا تھا، اور کساد بازاری کی شرح کتنی تھی، ہم "مندی میں افراط ز(stagflation)" کا شکار تھے جس نے کینیشین فلسفے کی گہری خامیوں کو ظاہر کیا، اور پھر ہمارے پاس ایک ایسا رہنما تھا جس نے ٹیکس کم کیے اور بہت سی صنعتوں کو ضوابط میں نرمی کے ذریعے آزاد کیا اور امریکہ نے ایک تجدید اور دوبارہ جنم کا تجربہ کیا، اور یہ تقریباً پچھلے پچیس سالوں یا اس سے زیادہ عرصے تک ہمیں لے گیا۔ ہمارے پاس بنیادی طور پر ترقی اور پیشرفت کی ایک اوپر کی طرف بڑھنے والی لہر تھی۔ بد قسمتی سے، حالیہ دنوں میں ہم دوبارہ پیچھے کی طرف گئے ہیں، کم از کم چند قدم پیچھے کی طرف۔ پہلے... ٹھیک ہے، میں ان تمام صدور اور سیاست دانوں کو قصوروار ٹھہرا سکتا ہوں، اور ریگن بھی کسی بھی طرح کامل نہیں تھے، لیکن حالیہ دنوں میں بش نے واقعی اس پسپائی کو تیز کیا اور اب اوباما اسے غیر معمولی حدوں تک لے جا رہے ہیں جو اس سے پہلے کسی بھی صدر نے کبھی نہیں کیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں، میں ایک کاروباری شخص ہوں، اور اس لیے میں پر امید ہوں۔

مجھے واقعی لگتا ہے کہ اس رجحان کو پلٹنا ممکن ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم ابھی ناقابل واپسی زوال

میں ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں جلد ہی کچھ سنگین تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ ایک چیز کے لیے ہم دیوالیہ ہو رہے ہیں۔ جب تک ہم اسے سنجیدگی سے لینے اور بغیر ٹیکس بڑھائے اور امریکہ کے کاروباری ادارے کو دبائے بغیر اس سے نمٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، جب تک ہم اس سے نمٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں، میں اس زوال کو ناگزیر دیکھتا ہوں۔ لیکن میں ابھی بھی پر امید ہوں!

پالمر: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ داری یکسانیت پیدا کرتی ہے یا یہ تنوع کے لیے جگہ پیدا کرتی ہے؟ میرا مطلب ہے وہ لوگ جو کوشر کھانا یا حلال کھانا پسند کرتے ہیں یا مذہبی، ثقافتی اور جنسی اقلیتیں...

میکی : آپ نے ان چیزوں کی فہرست بنا کر تقریباً سوال کا جواب دے دیا ہے۔ سرمایہ داری آخر کار لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا ہے تا کہ ایک دوسرے کیلئے قدر پیدا کی جاسکے، یہی سرمایہ داری ہے۔ اس میں یقیناً ذاتی مفاد کا عنصر بھی شامل ہے۔ اصل اور بنیادی بات تعاون کے ذریعے ایک دوسرے کیلئے قدر پیدا کرنا ہے، اور اس سے پیداوار کی کوششوں میں تنوع پیدا ہوتا ہے کیونکہ انسان اپنی چاہتوں اور خواہشات میں بہت مختلف ہوتے ہیں۔ سرمایہ داری، مارکیٹ میں تعاون کرتے ہوئے، ان چاہتوں اور خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس طرح یہ انفرادیت کے لیے بہت بڑی جگہ پیدا کرتی ہے۔ اگر آپ ایک آمرانہ معاشرے میں رہتے ہیں تو کوئی خاص مفاد گروپ، چاہے وہ مذہبی درجہ بندی ہو یا یونیورسٹی کے دانشور یا کچھ جنونی جو سوچتے ہیں کہ وہ سب کے لیے کیا بہتر ہے، وہ اپنی اقدار دوسروں پر مسلط کر سکتے ہیں۔ وہ دوسروں کو ہدایت دے سکتے ہیں۔ ایک سرمایہ

دارانہ معاشرے میں، آپ کے پاس انفرادیت کے لیے زیادہ جگہ ہوتی ہے۔ ایک سرمایہ دارانہ معاشرے میں لاکھوں پھولوں کے اگنے اور پھلنے پھولنے کی جگہ ہوتی ہے، محض اس لئے کہ انسانی خوشحالی آخر کار سرمایہ داری کا مقصد یا اختتام اور اسکی سب سے بڑی تخلیق ہے۔

پالمر : آپ کا ایک منصفانہ، کاروباری، خوشحال مستقبل کا وژن کیا ہے؟

میکی : جو میں دیکھنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ سرمایہ داری کے محافظ سب سے پہلے یہ سمجھنا شروع کریں کہ انہوں نے جو حکمت عملی استعمال کی ہے وہ واقعی ان کے مخالفین کے حق میں گئی ہے۔ انہوں نے اخلاقی فوقیت کو تسلیم کر لیا ہے اور انہوں نے سرمایہ داری کے دشمنوں کو اسے ایک استحصالی، لالچی، خود غرض نظام کے طور پر پیش کرنے کی اجازت دی ہے جو عدم مساوات پیدا کرتا ہے، مزدوروں کا استحصال کرتا ہے، صارفین کو دھوکہ دیتا ہے، اور ماحول کو تباہ کر رہا ہے جبکہ کمیونٹیز کو ختم کر رہا ہے۔ محافظوں کو اس کا جواب دینے کا طریقہ نہیں آتا کیونکہ انہوں نے پہلے ہی سرمایہ داری کے نقادوں کے سامنے تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے بجائے، انہیں اپنے ذاتی مفاد کی جنونیت سے ہٹ کر سرمایہ داری کی پیدا کردہ قدر کو دیکھنا چاہیے، نہ صرف سرمایہ کاروں کے لیے—حالانکہ، یقیناً، ایسا ہوتا ہے، لیکن اس قدر کو جو ان تمام لوگوں کے لیے پیدا ہوتی ہے جو کاروبار کے ساتھ تجارت کرتے ہیں: یہ گاہکوں کے لیے قدر پیدا کرتی ہے؛ یہ مزدوروں کے لیے قدر پیدا کرتی ہے؛ یہ سپلائرز کے لیے قدر پیدا کرتی ہے؛ یہ معاشرے کے لیے مجموعی طور پر قدر پیدا کرتی ہے؛ یہ حکومتوں کے لیے قدر پیدا کرتی ہے۔ میرا مطلب ہے، ہماری حکومت کہاں ہو گی بغیر ایک مضبوط کاروباری شعبے کے جو نوکریاں اور آمدنی اور دولت پیدا کرتا ہے جس پر وہ ٹیکس لگا سکتے ہیں؟ یاد رکھیں، ایسا نہیں

ہے کہ میں ہمیشہ اس سے خوش ہوں۔ سرمایہ داری قدر کا ذریعہ ہے۔ یہ سماجی تعاون کے لیے سب سے حیرت انگیز وسیلہ ہے جو کبھی موجود رہا ہے۔ اور یہی کہانی ہمیں سنانی ہے۔ ہمیں بیانیہ کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ اخلاقی نقطہ نظر سے، ہمیں سرمایہ داری کے بیانیہ کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ یہ مشترکہ قدر پیدا کرنے کے بارے میں ہے، نہ کہ چند کے لیے، بلکہ سب کے لیے۔ اگر لوگ اسے اس طرح دیکھ سکیں جس طرح میں اسے دیکھتا ہوں، تو لوگ سرمایہ داری سے اس طرح محبت کریں گے جس طرح میں اس سے محبت کرتا ہوں۔

پالمر: آپ کے وقت کا شکریہ۔

میکی: مجھے خوشی ہوئی، ٹام۔

آزادی اور وقار جدید دنیا
کی وضاحت کرتے ہیں

مصنف: ڈیئرڈرے این مک کلسکی

اس مضمون میں معاشی مورخ اور سماجی نقاد ڈیرڈری میک کلوسکی دلیل دیتی ہیں کہ جدید سرمایہ داری کی ترقی اور اس کے نتیجے میں بننے والی دنیا کو "مادی عوامل" سے مناسب طریقے سے نہیں سمجھایا جا سکتا، جیسا کہ بہت سارے مورخین نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کاروبار، تبادلہ، جدت، اور منافع کے بارے میں لوگوں کے سوچنے کے انداز میں تبدیلی تھی جس نے جدید سرمایہ داری کو تخلیق کیا اور عورتوں، ہم جنس پرستوں، مذہبی اختلاف رکھنے والوں، اور ان مظلوم عوام کو آزادی دی جن کی زندگیاں جدید زراعت، طب، بجلی، اور دیگر جدید سرمایہ دارانہ زندگی کے لوازمات کی ایجاد اور تجارت سے پہلے وحشیانہ، تکلیف دہ، اور مختصر تھیں۔

ڈیرڈری میک کلوسکی شکاگو کی یونیورسٹی آف الینوائے میں معاشیات، تاریخ، انگریزی، اور مواصلات کی پروفیسر ہیں۔ وہ معاشیات، معاشی تاریخ، شماریات، کمیونیکیشن، اور ادب پر تیرہ کتابوں کی مصنف ہیں، اس کے علاوہ ایک سوانح عمری "کراسنگ" بھی لکھ چکی ہیں۔ وہ جریدہ "Journal of Economic History" کی معاون مدیر رہ چکی ہیں اور علمی جرائد میں وسیع پیمانے پر شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب، جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے، "Bourgeois Dignity: Why Economics Can't Explain the Modern World" ہے۔

لوگوں کے مارکیٹوں اور جدت طرازی کو عزت دینے کے انداز میں تبدیلی نے صنعتی انقلاب اور پھر جدید دنیا کو جنم دیا۔ اس کے برعکس، پرانی روایتی حکمت میں تجارت اور جدت طرازی کے بارے میں رویوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، اور نہ ہی آزاد خیال سوچ کے لیے کوئی جگہ ہے۔ پرانی مادیت پسند کہانی کہتی ہے کہ صنعتی انقلاب مادی اسباب جیسے سرمایہ کاری یا چوری، بچت کی بلند شرحوں یا سامراجیت سے آیا تھا۔ آپ نے سنا ہے: "یورپ اپنی سلطنتوں کی وجہ سے امیر ہے"؛ "امریکہ کو غلاموں کی محنت پر بنایا گیا تھا"؛ چین تجارت کی وجہ سے امیر ہو رہا ہے۔

لیکن کیا ہو اگر صنعتی انقلاب لوگوں کے سوچنے کے طریقے میں تبدیلیوں کی وجہ سے اور خاص طور پر ایک دوسرے کے بارے میں ان کے خیالات کی وجہ سے شروع ہوا ہو؟ فرض کریں کہ بھاپ کے انجن اور کمپیوٹرز جدت طرازوں کے لیے ایک نئی عزت سے آئے، نہ کہ اینٹ پر اینٹ رکھنے یا مردہ افریقی پر مردہ افریقی رکھنے سے؟

ماہرین اقتصادیات اور مورخین یہ سمجھنا شروع کر رہے ہیں کہ صنعتی انقلاب کو شروع کرنے کے لیے چوری یا سرمائے کے جمع ہونے سے کہیں زیادہ ضرورت تھی۔ اس کے لیے مغربی لوگوں کی تجارت اور جدت طرازی کے بارے میں سوچنے کے طریقے میں بڑی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ لوگوں کو "تخلیقی تباہی" کو پسند کرنا شروع کرنا پڑا، یہ نیا خیال جو پرانے کی جگہ لیتا ہے۔ یہ موسیقی کی طرح ہے، ایک نیا بینڈ راک موسیقی میں ایک نیا خیال لاتا ہے اور اگر کافی لوگ آزادانہ طور پر نئے کو اپناتے ہیں تو پرانے کی جگہ لے لیتا ہے۔ اگر پرانی موسیقی کو خراب سمجھا جاتا ہے تو اسے تخلیقی صلاحیت سے "تباہ" کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح، بجلی کے

بلب نے مٹی کے تیل کے لیمپوں کو "تباہ" کر دیا، اور کمپیوٹرز نے ٹائپ رائٹرز کو "تباہ" کر دیا۔ اور اس سب میں ہماری بھلائی ہے۔

صحیح تاریخ کچھ یوں ہے: جب تک کہ 1600 کے آس پاس ڈچ یا 1700 کے آس پاس انگریزوں نے اپنے سوچنے کے انداز میں تبدیلی نہیں کی تھی، اس وقت تک آپ کو عزت صرف دو طریقوں سے ملتی تھی، یا تو فوجی بن کر یا پادری بن کر، قلعے میں یا چرچ میں۔ وہ لوگ جو محض خرید و فروخت کر کے یا جدت طرازی کر کے زندگی بسر کرتے تھے، انہیں گناہگار دھوکے باز کے طور پر حقیر سمجھا جاتا تھا۔ 1200 کی دہائی میں ایک قید خانے کے داروغہ نے ایک امیر آدمی کی رحم کی التجا کو مسترد کر دیا: "آیئے، ماسٹر ارناوُڈ تیسیر، آپ اتنی دولت میں ڈوبے ہوئے ہیں! آپ بغیر گناہ کے کیسے ہو سکتے ہیں؟"

1800 میں، دنیا بھر میں فی شخص فی دن اوسط آمدنی موجودہ دور کی رقم میں 1 ڈالر سے 5 ڈالر تک تھی۔ اسے اوسطاً 3 ڈالر فی دن کہیں۔ تصور کریں کہ آپ موجودہ دور کے ریو، ایتھنز یا جوہانسبرگ میں 3 ڈالر فی دن پر رہ رہے ہوں۔ (کچھ لوگ اب بھی ایسا کرتے ہیں۔) یہ اسٹاربکس میں کیپوچینو کا تین چوتھائی حصہ ہے، یہ خوفناک تھا اور ہے۔

پھر پہلے ہالینڈ اور پھر انگلینڈ میں کچھ بدلا۔ 1517 سے 1789 کے مابین یورپ کی انقلابات اور اصلاحات نے بشپ اور اشرافیہ کے باہر عام لوگوں کو آواز دی۔ یورپی اور پھر دیگر لوگ بین فرینکلن، اینڈریو کارنیگی، اور بل گیٹس جیسے کاروباری افراد کی تعریف کرنے لگے۔ متوسط طبقے کو اچھا سمجھا جانے لگا اور انہیں اچھے کام کرنے اور کامیاب ہونے کی اجازت ملنے لگی۔ لوگوں نے ایک متوسط طبقے کے معاہدے پر دستخط کیے جو اب امیر جگہوں جیسے برطانیہ،

سویڈن یا ہانگ کانگ میں عام ہے: "مجھے جدت طرازی کرنے دیں اور مختصر مدت میں ڈھیروں پیسے کمانے دیں، میں طویل مدت میں آپ کو امیر بنادوں گا۔"

اور یہی ہوا، 1700 کی دہائی میں فرینکلن کے لائٹننگ راڈ اور واٹ کے اسٹیم انجن سے شروع ہو کر، 1800 کی دہائی میں مزید جدت اور 2000 کی دہائی میں اس سے بھی زیادہ، وہ مغرب جو صدیوں سے چین اور اسلام سے پیچھے تھا، حیرت انگیز حد تک جدت طراز بن گیا۔

پہلی بار انسانی تاریخ میں متوسط طبقے کو عزت اور آزادی ملی، اب آپ کو بھاپ کا انجن، خود کار ٹیکسٹائل لوم، اسمبلی لائن، سمفنی آرکسٹرا، ریلوے، کارپوریشن، غلامی کے خاتمے کی تحریک، بھاپ پرنٹنگ پریس، سستا کاغذ، وسیع خواندگی، سستا سٹیل، سستا پلیٹ گلاس، جدید یونیورسٹی، جدید اخبار، صاف پانی، مضبوط کنکریٹ، خواتین کی تحریک، بجلی کی روشنی، لفٹ، آٹوموبائل، پیٹرولیم، ییلو اسٹون میں چھٹیاں، پلاسٹک، سالانہ آدھی ملین نئ انگریزی زبان کی کتابیں، ہائبرڈ مکئ، پینسلن، ہوائی جہاز، صاف شہری ہوا، شہری حقوق، اوپن ہارٹ سرجری اور کمپیوٹر سب ملتا ہے۔

مڈل کلاس ڈیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ تاریخ میں پہلی بار عام لوگوں، خاص طور پر انتہائی غریب لوگوں کی حالت بہتر ہوئی۔ اب امریکہ کے سب سے غریب پانچ فیصد لوگ ایئر کنڈیشنگ اور آٹوموبائل میں بھارت کے سب سے امیر پانچ فیصد لوگوں کے برابر ہیں۔

اب ہم چین اور بھارت میں اسی تبدیلی کو دیکھ رہے ہیں، جو دنیا کی 40 فیصد آبادی ہیں۔ ہمارے دور کی سب سے بڑی معاشی کہانی 2007–2009 کی عظیم کساد بازاری نہیں ہے،

حالانکہ یہ ناخوشگوار تھی۔ بڑی کہانی یہ ہے کہ چینیوں نے 1978 میں اور پھر بھارتیوں نے 1991 میں اپنی معیشتوں میں آزاد خیال نظریات کو اپنایا اور تخلیقی تباہی کا خیر مقدم کیا۔ اب ان کی فی کس اشیا اور خدمات ہر نسل میں چار گنا بڑھ رہی ہیں۔

اب تک ان کئی جگہوں پر جہاں متوسط طبقے کی آزادی اور عزت کو اپنایا گیا ہے، اوسط شخص ایک دن میں 100 ڈالر سے زیادہ کماتا اور خرچ کرتا ہے۔ یاد رکھیں: اسی قیمتوں پر دو صدی قبل یہ 3 ڈالر یومیہ تھی۔ اور اس میں بہت سی چیزوں کے معیار جیسے بجلی کی لائٹس سے اینٹی بائیوٹکس تک میں بہتری کا حساب نہیں لگایا گیا ہے۔ جاپان، ناروے اور اٹلی کے نوجوان لوگ، یہاں تک کہ محتاط انداز میں ناپے جانے پر بھی، اپنے پر داداؤں سے تقریباً تیس گنا بہتر حالت میں ہیں۔ جدید دنیا میں دیگر تمام بہتریاں—زیادہ جمہوریت، خواتین کی آزادی، متوقع عمر میں اضافہ، بہتر تعلیم، روحانی ترقی، اور فنکارانہ انقلاب اور، خوراک، تعلیم، اور سفر میں 2,900 فیصد اضافہ، سب جدید تاریخ کے عظیم حقیقت سے مضبوطی سے منسلک ہیں۔

یہ اتنی بڑا، اتنی بے مثال اور عظیم حقیقت ہے کہ اسے معمول کے اسباب جیسے تجارت، استحصال، سرمایہ کاری یا سامراجیت سے نکلتا ہوا دیکھنا ناممکن ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں ماہرین اقتصادیات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جیسے کہ معمولات۔ پھر بھی چین، عثمانی سلطنت، روم اور جنوبی ایشیا میں بڑے پیمانے پر یہ تمام معمولات ہو چکے تھے۔ مشرق وسطیٰ میں غلامی عام تھی، بھارت میں تجارت بہت بڑی تھی، اور چینی نہروں اور رومی سڑکوں میں سرمایہ کاری بہت بڑی تھی۔ پھر بھی کوئی عظیم حقیقت پیش نہیں آئی۔ معمول کے اقتصادی نوعیت کی وضاحتوں میں کچھ گہرائی سے غلط ہونا چاہیے۔

دوسرے لفظوں میں جدید دنیا کو سمجھانے کے لیے صرف معاشی مادیت پر انحصار کرنا، چاہے وہ بائیں بازو کی تاریخی مادیت ہو یا دائیں بازو کی معیشت، غلط ہے۔ انسانی وقار اور آزادی کے خیالات نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ جیسا کہ معاشی مورخ جوئیل موکیر کہتے ہیں، "تمام ادوار میں معاشی تبدیلی زیادہ تر ماہرین اقتصادیات کی سوچ سے زیادہ اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ لوگ کیا مانتے ہیں۔" بڑی مادی تبدیلیاں نتیجہ تھیں، سبب یا وجہ نہیں۔ یہ خیالات یا "بیان بازی" تھی جس نے ہماری خوشحالی اور اس کے ساتھ ہماری جدید آزادیوں کو بھی پیدا کیا۔

مقابلہ اور تعاون

اس مضمون میں، تھنک ٹینک کے ایگزیکٹو اور ماہر ڈیوڈ بواز مقابلے اور تعاون کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتے ہیں، جنہیں اکثر متضاد متبادل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے: ایک معاشرہ ایک اصول کے مطابق منظم ہوتا ہے یا دوسرے کے مطابق۔ اسکے برعکس جیسے کہ بواز وضاحت کرتے ہیں، سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام میں لوگ دوسروں کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے مقابلہ کرتے ہیں۔

ڈیوڈ بواز کیٹو انسٹیٹیوٹ(Cato Institute) کے ایگزیکٹو وائس پریزیڈنٹ ہیں اور اسٹوڈنٹس فورلبرٹی کے مشیر ہیں۔وہ "**لیبر ٹیریزم: اے پرائمر**(Libertarianism: A Primer)" کے مصنف اور پندرہ دیگر کتابوں کے ایڈیٹر ہیں، جن میں "دی لیبر ٹیرین ریڈر: کلاسک اینڈ کنٹیمپریری رائٹنگز فرام لاؤزیوٹو ملٹن فریڈمین(The Libertarian Reader: Classic and Contemporary Writings from Lao Tzu to Milton Friedman.) " شامل ہے۔انہوں نے نیویارک ٹائمز،وال اسٹریٹ جرنل،اور واشنگٹن پوسٹ جیسے اخباروں کے لیے لکھا ہے، وہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اکثر تبصرہ کرتے ہیں،اور Cato@Liberty،دی گارڈین،دی آسٹریلین،اور انسائیکلوپیڈیابریٹانیکا کے لیے باقاعدگی سے بلاگ بھی لکھتے ہیں۔ مارکیٹ کے عمل کے حامی اکثر مقابلے کے فوائد پر زور دیتے ہیں۔مقابلے کا عمل مسلسل ٹیسٹنگ، تجربہ کرنے،اور بدلتی ہوئی صورتحال کے مطابق

ڈھالنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ کاروباروں کو مسلسل چوکس رکھتا ہے تاکہ وہ صارفین کی خدمت کر سکیں۔ تجزیاتی اور عملی طور پر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مقابلے کے نظام مرکزی یا اجارہ داری کے نظاموں سے بہتر نتائج فراہم کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے، کتابوں، اخباروں کے مضامین اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں آزاد مارکیٹ کے حامی مقابلے کی مارکیٹ کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور مقابلے پر پابندیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔

لیکن بہت سے لوگ مقابلے کی تعریفات سنتے ہیں اور ان الفاظ جیسے کہ دشمنی، کٹر مقابلہ، یا ایک دوسرے کو کھا جانے کی صورت حال کو سنتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ کیا تعاون ایسی متضاد حالت سے بہتر نہیں ہو گا۔ مثال کے طور پر ارب پتی سرمایہ کار جارج سوروس، اٹلانٹک ماہنامے میں لکھتے ہیں، "زیادہ مقابلہ اور کم تعاون ناقابل برداشت عدم مساوات اور عدم استحکام کا سبب بن سکتے ہیں۔" وہ مزید کہتے ہیں کہ ان کا "اصل نقطہ نظر یہ ہے کہ تعاون نظام کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ مقابلہ، اور 'مفید کی بقا کی جدوجہد' کا نعرہ اس حقیقت کو مسخ کرتا ہے۔"

یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ "مفید کی بقا کی جدوجہد (survival of the fittest)" کا فقرہ آزاد مارکیٹوں اور آزادی کے حامیوں کے ذریعہ شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہ فقرہ حیاتیاتی ارتقاء کے عمل کو بیان کرنے اور ایسی خصلتوں کی بقا کا حوالہ دینے کے لیے بنایا گیا تھا جو ماحول کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھے؛ یہ مارکیٹ میں کاروباروں کی مقابلے پر بھی لاگو ہو سکتا ہے، لیکن یہ قطعی طور پر یہ ظاہر کرنے کے لیے نہیں ہے کہ صرف سب سے زیادہ موزوں افراد ہی سرمایہ دارانہ نظام میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ اقتصادی مقابلے کی وضاحت

کے لیےSurvival of the Fittest کی اصطلاح وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو مارکیٹ کے عمل کے دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں۔

یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ انسان "تعاون کے لیے بنائے گئے ہیں، مقابلے کے لیے نہیں" وہ اس بات کو تسلیم کرنے میں ناکام رہتے ہیں کہ مارکیٹ تعاون ہے۔ حقیقت میں جیسا کہ نیچے بیان کیا گیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو تعاون کرنے کے لیے مقابلہ کرتے ہیں۔

انفرادیت پسندی اور برادری

اسی طرح کلاسیکی لبرل ازم کے مخالفین نے لبرلز پر "ایٹومسٹک" انفرادیت پسندی کی حمایت کا الزام عائد کیا ہے، جس میں ہر شخص خود میں ایک جزیرہ ہوتا ہے، صرف اپنے ذاتی فائدے کے لیے فکر مند ہوتا ہے اور دوسروں کی ضروریات یا خواہشات کی پرواہ نہیں کرتا۔ واشنگٹن پوسٹ کے ای جے ڈیون جونیئر نے لکھا ہے کہ جدید حریت پسند یقین رکھتے ہیں کہ "افراد دنیا میں مکمل طور پر بالغ کی حیثیت سے آتے ہیں جنہیں ان کی پیدائش کے لمحے سے ہی اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔" کالم نویس چارلس کروتھمر (Charles Krauthammer)نے چارلس موری کی کتاب **"What It Means to Be a Libertarian"** کے ریویو میں لکھا کہ موری کے آنے سے پہلے حریت پسند نظریہ "ایک سخت انفرادیت پسندوں کی نسل تھی جو ہر ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک کیبن میں رہتے تھے جس کے باہر باڑ اور 'داخلہ ممنوع' کا نشان ہوتا تھا۔" انہوں نے "ہر ایک کو دانتوں تک مسلح" شامل کرنے کی بات کیوں نہیں کی، یہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یقیناً، کوئی بھی اس قسم کی "ایٹومسٹک انفرادیت پسندی" پر یقین نہیں رکھتا جس کا پروفیسرز اور ماہرین مذاق ہیں۔ ہم واقعی مل کر رہتے ہیں اور گروپوں میں کام کرتے ہیں۔ ہماری پیچیدہ جدید معاشرت میں ایٹومسٹک انفرادیت پسند ہونا کس طرح ممکن ہے، یہ واضح نہیں ہے: کیا اس کا مطلب ہے کہ صرف وہی کھائیں جو آپ اگاتے ہیں، وہی پہنیں جو آپ بناتے ہیں، خود کے لیے بنائی ہوئی گھر میں رہیں، یا صرف قدرتی ادویات پر انحصار کریں جو آپ پودوں سے نکالتے ہیں؟ کچھ سرمایہ داری کے نقاد یا "قدرت کی طرف واپس جانے" کے حامی جیسے انابومبریا آل گور، اگر وہ واقعی اپنی کتاب "Earth in the Balance" میں جو لکھا تھا وہی مطلب رکھتے تھے، ایسے منصوبوں کی تائید کر سکتے ہیں۔ لیکن چند ہی حریت پسند اس بات پر آمادہ ہوں گے کہ کسی صحرائی جزیرے پر منتقل ہو جائیں اور اڈم سمتھ کے "Great Society" کے فوائد کو ترک کر دیں، جو کہ معاشرتی تعامل کے ذریعے پیچیدہ اور پیداواری معاشرت سے ممکن ہوا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ سمجھدار صحافی رک جائیں، اپنے لکھے الفاظ کو دیکھیں، اور خوٹ سوچیں، "میں نے شاید اس موقف کی غلط ترجمانی کی ہے، مجھے دوبارہ آزادی پسند (حریت پسند) مصنفین کو پڑھنا چاہیے۔"

ہمارے زمانے میں تنہائی اور ایٹومسٹک انفرادیت پسندی کے بارے میں یہ بے بنیاد بات مارکیٹ کے عمل کے حامیوں کے لیے بہت نقصان دہ رہی ہے۔ ہمیں واضح کرنا چاہیے کہ ہم جارج سوروس کے ساتھ متفق ہیں کہ "تعاون نظام کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ مقابلہ۔" دراصل، ہم تعاون کو انسانی ترقی کے لیے اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم صرف اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتے؛ ہم ایسی سماجی ادارے بنانا چاہتے ہیں جو اس کو ممکن بنائیں۔ یہی بات جائیداد کے حقوق، محدود حکومت اور قانون کی حکمرانی کے مقصد کی ہے۔

ایک آزاد معاشرت میں افراد کو قدرتی اور نا قابل منسوخ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور انہیں دوسروں کے حقوق کا احترام کرنے کی عمومی ذمہ داری پوری کرنی ہوتی ہے۔ ہماری دیگر ذمہ داریاں وہ ہیں جو ہم معاہدے کے ذریعے قبول کرتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ زندگی، آزادی، اور جائیداد کے حقوق پر مبنی معاشرت سماجی امن اور مادی خوشحالی بھی پیدا کرتی ہے۔ جیسے جان لاک، ڈیوڈ ہیوم، اور دوسرے کلاسیکی لبرل فلسفیوں نے ظاہر کیا، ہمیں سماجی تعاون پیدا کرنے کے لیے ایک نظامِ حقوق کی ضرورت ہے، جس کے بغیر لوگ بہت کم حاصل کرسکتے ہیں۔

ہیوم نے اپنی "Treatise of Human Nature" میں لکھا ہے کہ انسانی حالات (1) ہمارے ذاتی مفادات، (2) دوسروں کے لیے ہماری محدود سخاوت اور (3) وسائل کی کمی، جو ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دستیاب ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے ہمارے لیے دوسروں کے ساتھ خاص طور پر جائیداد اور تبادلے کے بارے میں تعاون اور انصاف کے قواعد پورے کرنے لازمی ہیں۔ خاص طور پر جائیداد اور تبادلے کے بارے میں کہ ہم ایسا کیسے کرسکتے ہیں۔ ضروری ہے تاکہ ہم یہ تعین کرسکیں کہ ہم کیسے تعاون کرسکتے ہیں۔ یہ قواعد تعین کرتے ہیں کہ کس کے پاس مخصوص جائیداد کے استعمال کا حق ہے۔ اچھی طرح سے متعین جائیداد کے حقوق کی عدم موجودگی میں، ہم اس مسئلے پر مسلسل تصادم کا سامنا کریں گے۔ جائیداد کے حقوق پر ہمارا معاہدہ ہمیں تعاون اور ہم آہنگی کے پیچیدہ سماجی کاموں کو انجام دینے کے قابل بناتا ہے، جس کے ذریعے ہم اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔

یہ اچھا ہوگا کہ بغیر خود غرضی اور انفرادی حقوق پر زور کے اگر محبت اس کام کو انجام دے سکتی اور لبرلزم کے مخالفین نے ایک دلکش معاشرتی تصور پیش کیا ہے جو عالمی خیر خواہی پر مبنی

ہے۔ لیکن جیسا کہ ایڈم اسمتھ نے نشاندہی کی، "مہذب معاشرے میں [انسان] ہمیشہ بہت سے لوگوں کے تعاون اور مدد کا محتاج ہوتا ہے"، پھر بھی اپنی پوری زندگی میں وہ ان لوگوں کی ایک چھوٹی سی تعداد سے بھی دوستی نہیں کر سکتا جن کے تعاون کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہم مکمل طور پر خیر خواہی پر انحصار کرتے تو ہم پیچیدہ کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔ دوسروں کی خود غرضی پر انحصار کرنا اور اچھی طرح سے متعین جائیداد کے حقوق اور آزادانہ تبادلے کے نظام میں، ایک چھوٹے گاؤں سے زیادہ پیچیدہ معاشرے کو منظم کرنے کا واحد طریقہ ہے۔

سول سوسائٹی

ہم دوسروں کے ساتھ منسلک ہونا چاہتے ہیں تاکہ عملی مقاصد حاصل کر سکیں جیسے مزید خوراک پیدا کرنا، سامان کا تبادلہ کرنا، نئی ٹیکنالوجی تیار کرنا، بلکہ اس لیے بھی کہ ہم محبت، دوستی، اور کمیونٹی کے لیے گہرے انسانی تعلق کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جو رشتے ہم دوسروں کے ساتھ بناتے ہیں، وہ مل کر وہ بناتے ہیں جسے ہم سول سوسائٹی کہتے ہیں۔ یہ تعلقات مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں جیسے خاندان، گرجا گھر، اسکول، کلب، بھائی چارے کی سوسائٹیاں، کنڈومینیم ایسوسی ایشنز، محلے کے گروپس، اور تجارتی معاشرت کی بے شمار شکلیں، جیسے شراکت داریاں، کارپوریشنز، مزدور یونینیز، اور تجارتی ایسوسی ایشنز۔ یہ تمام تعلقات انسانی ضروریات کو مختلف طریقوں سے پورا کرتے ہیں۔ سول سوسائٹی کو وسیع طور پر معاشرے میں تمام قدرتی اور رضاکارانہ تنظیموں کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

کچھ تجزیہ کار یہ دلیل دیتے ہوئے تجارتی اور غیر منافع بخش تنظیموں کے درمیان فرق کرتے

ہیں کہ کاروبار مارکیٹ کا حصہ ہیں، سول سوسائٹی کا نہیں؛ لیکن میں اس روایت کی پیروی کرتا ہوں کہ حقیقی فرق جابرانہ تنظیموں، ریاست اور قدرتی یا رضاکارانہ تنظیموں یا ہر دوسری چیز کے درمیان ہے۔ چاہے کوئی خاص تنظیم منافع کمانے کے لیے قائم کی گئی ہو یا کوئی اور مقصد حاصل کرنے کے لیے، اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہماری شمولیت رضاکارانہ طور پر منتخب ہوتی ہے۔

سول سوسائٹی اور "قومی مقصد" کے بارے میں تمام عصری الجھن کے ساتھ، ہمیں ایف اے ہائیک کے اس نکتے کو یاد رکھنا چاہیے کہ سول سوسائٹی کے اندر کی تنظیمیں ایک خاص مقصد حاصل کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں، لیکن مجموعی طور پر سول سوسائٹی کا کوئی ایک مقصد نہیں ہوتا؛ یہ تمام مقصدی تنظیموں کا غیر ارادی اور خود ساختہ ابھرنے والا نتیجہ ہے۔

بازار بطور تعاون

بازار سول سوسائٹی کا ایک اہم عنصر ہے۔ بازار دو حقائق سے پیدا ہوتا ہے: انسان دوسرے لوگوں کے ساتھ تعاون کرنے سے زیادہ حاصل کر سکتا ہے بہ نسبت انفرادی طور پر، اور ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اگر ہم ایک ایسی نوع ہوتے جس کے لیے تعاون تنہا کام کے مقابلے میں زیادہ نتیجہ خیز نہ ہوتا، یا اگر ہم تعاون کے فوائد کو نہیں سمجھ سکتے، تو ہم الگ تھلگ اور ایٹمی حیثیت میں رہ جاتے۔ لیکن اس سے بھی بدتر، جیسا کہ لوڈوِگ وان میسیز نے وضاحت کی، "ہر آدمی کو دوسرے تمام آدمیوں کو اپنا دشمن سمجھنے پر مجبور ہونا پڑتا؛ اپنی خواہشات کی تسکین کی طلب اسے اپنے تمام پڑوسیوں کے ساتھ ایک ناقابل مصالحت تصادم میں لے

آتی۔ "تعاون اور محنت کی تقسیم سے باہمی فائدے کے امکان کے بغیر، نہ ہمدردی اور دوستی کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی بازار کا نظام وجود میں آسکتا ہے۔

بازار کے نظام میں، افراد اور فرمیں بہتر تعاون کرنے کے لیے مقابلہ کرتی ہیں۔ جنرل موٹرز اور ٹویوٹا میرے نقل و حمل کے مقصد کو حاصل کرنے میں میرے ساتھ تعاون کرنے کے لیے مقابلہ کرتے ہیں۔ اے ٹی اینڈ ٹی اور ایم سی آئی میرے ساتھ دوسروں کے ساتھ رابطے کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کرتے ہیں۔ در حقیقت، وہ میرے کاروبار کے لیے اتنے جارحانہ مقابلہ کرتے ہیں کہ میں نے ایک اور مواصلاتی فرم کے ساتھ تعاون کیا ہے جو مجھے جواب دینے والی مشین کے ذریعے سکون فراہم کرتی ہے۔

بازاروں کے ناقدین اکثر شکایت کرتے ہیں کہ سرمایہ داری خود غرضی کو فروغ دیتی ہے اور اسے انعام دیتی ہے۔ حقیقت میں لوگ کسی بھی سیاسی نظام کے تحت خود غرض ہوتے ہیں۔ بازار ان کی خود غرضی کو سماجی طور پر مفید سمتوں میں منتقل کرتے ہیں۔ ایک آزاد بازار میں لوگ اپنے مقاصد اس طرح حاصل کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ دوسرے کیا چاہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ اسے فراہم کریں۔ اس کا مطلب ہو سکتا ہے کہ کئی لوگ مل کر ایک مچھلی پکڑنے کا جال یا سڑک بنائیں۔ ایک زیادہ پیچیدہ معیشت میں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنا منافع اس طرح تلاش کریں کہ وہ ایسی چیزیں یا خدمات فراہم کریں جو دوسروں کی ضروریات یا خواہشات کو پورا کریں۔ جو کارکن اور کاروباری افراد ان ضروریات کو بہترین طریقے سے پورا کریں گے، انہیں انعام دیا جائے گا؛ جو ایسا نہیں کریں گے، وہ جلد ہی یہ جان جائیں گے اور ان کے زیادہ کامیاب حریفوں کی نقل کرنے یا ایک نئے طریقے کو آزمانے کی ترغیب دی جائے گی۔

بازار میں ہم جو مختلف اقتصادی تنظیمیں دیکھتے ہیں، وہ بہتر طریقے تلاش کرنے کے تجربات ہیں تا کہ باہمی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تعاون کیا جا سکے۔ جائیداد کے حقوق کا نظام، قانون کی حکمرانی اور کم سے کم حکومت لوگوں کو تعاون کی نئی شکلوں کے ساتھ تجربہ کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرتی ہے۔ کارپوریشن کے قیام نے بڑے اقتصادی کاموں کو انجام دینے کی اجازت دی، جو افراد یا شراکت داریاں نہیں کر سکتی تھیں۔ تنظیمیں جیسے کنڈومینیم ایسوسی ایشنز، میوچل فنڈز، انشورنس کمپنیاں، بینک، کارکنوں کی ملکیت والے کوآپریٹوز اور مزید نئی شکلوں کے ذریعے مخصوص اقتصادی مسائل حل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ شکلیں غیر مؤثر ثابت ہوئیں؛ مثال کے طور پر 1960 کی دہائی میں بہت سے کارپوریٹ گروپس ناقابل انتظام ثابت ہوئے اور شیئر ہولڈرز نے پیسہ کھو دیا۔ بازار کے عمل کی تیز رفتار فیڈ بیک کامیاب تنظیموں کو نقل کرنے اور ناکام تنظیموں کی حوصلہ شکنی کے لیے ترغیب فراہم کرتی ہیں۔

تعاون سرمایہ داری کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا مقابلہ۔ دونوں قدرتی آزادی کے سادہ نظام کے لازمی عناصر ہیں اور ہم میں سے زیادہ تر اپنا وقت شراکت داروں، ساتھی کارکنوں، سپلائرز اور صارفین کے ساتھ تعاون کرنے میں گزارتے ہیں، بجائے اس کے کہ مقابلہ کریں۔

زندگی واقعی ناخوشگوار، ظالمانہ اور مختصر ہو جائے گی اگر یہ تنہائی میں گزاری جائے۔ خوش قسمتی سے سرمایہ دارانہ معاشرے میں ایسا نہیں ہے۔

منافع کمانے والا علاج اور ہمدردی کا محرک

اس مضمون میں، اس کتاب کے ایڈیٹر نے درد کے علاج کے ذاتی تجربے پر مبنی ایک ذاتی غور و فکر پیش کیا ہے۔ اسے ایک عام نظریے کے طور پر پیش نہیں کیا گیا، اور نہ ہی یہ سماجی علوم میں کوئی حصہ ڈالنے کی کوشش ہے۔ یہ کاروباری ادارے اور ہمدردی کے درمیان تعلق کو واضح کرنے کی کوشش ہے۔

منافع کمانے والا علاج یقیناً ایک خوفناک اور غیر اخلاقی چیز ہونی چاہیے۔ آخر کار، میں نے سنا ہے اس پر ہر وقت تنقید ہوتی ہے۔ درحقیقت، جب میں یہ لکھ رہا ہوں میں کینیڈین براڈکاسٹنگ کارپوریشن پر نجی ہسپتالوں کے حوالے سے ایک تلخ حملہ سن رہا ہوں۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ جب ڈاکٹرز، نرسیں، اور ہسپتال کے منتظمین صرف اپنی آمدنی کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں، تو ہمدردی کی جگہ سرد دل خود غرضی لے لیتی ہے۔ لیکن جب مجھے ایک تکلیف دہ اور معذور کرنے والی حالت سے نجات کے لیے دو ہسپتالوں کا دورہ کرنا پڑا، ایک منافع کمانے والا اور دوسرا غیر منافع بخش، تو مجھے اس مسئلے کا ایک نیا نظریہ ملا۔

حال ہی میں مجھے ریڑھ کی ہڈی میں ایک ڈسک کے پھٹنے کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے مجھے ایسے درد ہوئے جو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کئے تھے۔ میں ایک مقامی منافع کمانے والے ہسپتال میں ایک ماہر کے پاس گیا اور اس نے مجھے ایک گھنٹے کے اندر قریب کے منافع کمانے والے ریڈیولوجی کلینک میں ایم آر آئی (میگنیٹک ریزونس امیجنگ) اسکین کے لیے بھیج

دیا۔ پھر اس نے مجھے ایک ایپیڈورل انجیکشن دلوانے کا انتظام کیا تا کہ ریڑھ کی ہڈی میں آنے والے اعصاب کی سوزش کو کم کیا جا سکے، جو درد کا سبب تھے۔ میں اتنی اذیت میں تھا کہ میں بمشکل حرکت کر پا رہا تھا۔ جس منافع کمانے والے ہسپتال میں میں گیا تھا وہاں کے منافع کمانے والے درد کلینک میں ڈاکٹروں اور نرسوں نے مجھے غیر معمولی مہربانی دکھائی اور نرمی سے علاج کیا۔ نرس نے اس بات کو یقینی بنایا کہ مجھے عمل کا سمجھ آ جائے اور میں تمام ہدایات سمجھ سکوں، پھر ایپیڈورل انجیکشن دینے والی ڈاکٹر نے اپنا تعارف کرایا، ہر مرحلے کی وضاحت کی اور پھر نمایاں پیشہ ورانہ مہارت اور میری صحت بارے واضح تشویش کے ساتھ آگے بڑھا۔

چند ہفتے بعد میری حالت اگرچہ اب بھی تکلیف دہ اور معذور کرنے والی تھی لیکن کافی بہتر ہو چکی تھی۔ میرے ڈاکٹر نے مجھے ایک اور ایپیڈورل انجیکشن لینے کی سفارش کی تا کہ مجھے ایک نارمل حالت کی طرف مزید پیش رفت ہو سکے۔ بدقسمتی سے منافع کمانے والے درد کلینک کی تین ہفتے تک مکمل بکنگ تھی۔ میں اتنی دیر انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا اور علاقے کے کچھ دوسرے ہسپتالوں کو فون کیا۔ ایک بہت معروف اور انتہائی معتبر غیر منافع بخش ہسپتال میں مجھے دو دن کے اندر جگہ مل سکتی تھی، میں نے خوشی سے ملاقات کا وقت مقرر کر لیا۔

جب میں غیر منافع بخش ہسپتال پہنچا، تو میں نے پہلے کچھ مددگار ریٹائرڈ خواتین اور حضرات سے بات کی جو صاف ستھرے رضاکارانہ یونیفارم پہنے ہوئے تھے۔ یہ لوگ واضح طور پر خیر خواہ تھے، جیسا کہ ایک غیر منافع بخش ہسپتال میں توقع کی جا سکتی ہے۔ پھر میں اپنی چھڑی کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے درد کے کلینک تک پہنچا، جہاں میں نے استقبالیہ پر اپنا نام درج

کروایا۔ ایک نرس باہر آئی اور میرا نام پکارا، اور جب میں نے اپنی شناخت کرائی تو وہ لابی میں میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ انٹرویو اس وقت ہوا جب میں اجنبیوں سے گھرا ہوا تھا۔ شکر ہے کہ کوئی شرمناک سوالات نہیں پوچھے گئے۔ میں نے نوٹ کیا کہ دوسری نرسیں درحقیقت مریضوں کو حکم دینے کے انداز میں بات کر رہی تھیں۔ ایک نرس نے ایک خاتون کو جو واضح طور پر درد میں تھی، دوسری کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور جب مریضہ نے کہا کہ وہ جہاں بیٹھی ہے وہاں زیادہ آرام دہ ہے، تو نرس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا، "نہیں۔ بیٹھو!" جب وہی نرس میری طرف آئی، تو میرے خیال میں میری نظر نے اسے بتایا کہ میں کسی فرمانبرداری کے اسکول میں داخلہ لینے والے کی طرح سلوک کیے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے خاموشی سے معائنے کے کمرے کی طرف اشارہ کیا، جس میں میں داخل ہو گیا۔

معائنہ کرنے والے ڈاکٹر اندر آئے۔ نہ کوئی تعارف، نہ کوئی نام، نہ ہاتھ ملانے کی کوشش۔ اس نے میری فائل دیکھی، خود سے بڑبڑایا اور مجھے بستر پر بیٹھنے، پتلون نیچے کرنے اور شرٹ اٹھانے کو کہا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ عمل پہلے بھی کیا گیا تھا جب میں اپنی ایک طرف لیٹا ہوا تھا اور یہ پوزیشن زیادہ آرام دہ تھی کیونکہ بیٹھنا کافی تکلیف دہ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے بیٹھا ہوا ہی پسند کرتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں اپنی طرف لیٹنا پسند کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ بیٹھنا بہتر رسائی کی اجازت دیتا ہے، جو کم از کم ایک وجہ تھی جو میری دلچسپی کے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی موزوں تھی، اس لیے میں نے رضامندی ظاہر کی۔ پھر منافع بخش ہسپتال کے ڈاکٹر کے برعکس، اس نے سوئی کو اتنی شدت سے اور دردناک قوت کے ساتھ لگایا جو میرے پچھلے تجربے کے بالکل برعکس تھا کہ میری چیخ نکل گئی، پھر اس نے سوئی ہٹا دی، اپنی

فائل میں کچھ نوٹ کیا اور غائب ہو گیا۔ نرس نے مجھے ایک کاغذ کا ٹکڑا دیا اور باہر جانے کا راستہ بتایا۔ میں نے ادائیگی کی اور وہاں سے نکل آیا۔

منافع اور ہمدردی

یہ منافع بخش اور غیر منافع بخش طبی علاج کا موازنہ کرنے کے لیے بہت محدود تجربہ ہے۔ لیکن یہ منافع کے محرک اور اس کے ہمدردی سے تعلق کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف منافع بخش ہسپتال ہی مہربان اور ہمدرد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں کیونکہ غیر منافع بخش ہسپتال میں بزرگ رضاکار یقینی طور پر مہربان اور ہمدرد تھے۔ لیکن میں اس سوچ سے نہیں بچ سکتا کہ منافع بخش ہسپتال کے منافع بخش درد کلینک میں کام کرنے والے ڈاکٹروں اور نرسوں کو اپنی ہمدردی کا مظاہرہ کرنے کی کوئی ترغیب تھی۔ آخر کار اگر مجھے مزید علاج کی ضرورت پڑی یا اگر کسی نے مجھ سے صلاح لی تو میں منافع بخش ہسپتال کے بارے میں ہی سوچوں گا۔ لیکن میں نہ تو غیر منافع بخش ہسپتال واپس جاؤں گا اور نہ ہی کسی کو اسکی صلاح دوں گا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں جانتا ہوں کیوں: وہاں کے ڈاکٹروں اور نرسوں کے پاس مجھے واپس جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اور اب میں سمجھتا ہوں کہ غیر منافع بخش ہسپتال نے مجھے اتنی جلدی کیسے فٹ کر دیا۔ مجھے شک ہے کہ ان کے پاس کئی بار آنے والے مریض ہوتے ہیں۔

یہ تجربہ اس بات کی نشاندہی نہیں کرتا کہ منافع ہمدردی، خیر خواہی یا شائستگی کے لیے ضروری یا حتیٰ کہ کافی شرط ہے۔ میں ایک غیر منافع بخش تنظیم میں کام کرتا ہوں، جو ایک وسیع بنیاد کے ڈونرز کی مسلسل معاونت پر انحصار کرتی ہے۔ اگر میں انکے لئے اپنی وفاداریوں کی ذمہ

داریوں کو پورا کرنے میں ناکام رہا تو وہ میرے کام کی معاونت کرنا چھوڑ دیں گے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں اور میرے ساتھی وہاں کام کرتے ہیں کیونکہ ہم ڈونرز کے ساتھ ایک جیسے خدشات کا اشتراک کرتے ہیں، اس لیے یہ انتظام ہم آہنگی سے کام کرتا ہے۔ لیکن جب ڈونرز، ملازمین، اور "کلائنٹس" (چاہے وہ درد میں مبتلا لوگ ہوں یا معلومات اور بصیرت کی ضرورت والے صحافی اور معلم) سب ایک جیسے اقدار یا اہداف کا اشتراک نہیں کرتے، جیسا کہ غیر منافع بخش ہسپتال میں، منافع کا محرک ان اہداف کو ہم آہنگ کرنے کے لیے طاقتور کردار ادا کرتا ہے۔ اچھی طرح سے متعین اور نافذ شدہ قانونی حقوق کے سیاق و سباق میں کمائے گئے منافع (جسے ایک بہترین چور ہونے کے منافع سے ممتاز کیا جاتا ہے) سرد مہری کا نہیں بلکہ ہمدردی کا بنیاد فراہم کرسکتے ہیں۔ منافع کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ڈاکٹر مریض کے مفادات پر غور کرے، خود کو مریض کی جگہ پر رکھے، دوسروں کی تکلیف کا تصور کرے اور ہمدردی کا اظہار کرے۔ ایک آزاد مارکیٹ کی معیشت میں، منافع کا محرک شاید ہمدردی کے محرک کا ایک دوسرا نام ہو سکتا ہے۔

باب نمبر 2
رضاکارانہ تعامل
اور خود غرضی

اخلاقیات کا تضاد

ترجمہ: جوڈبلانشٹ

اس مضمون میں چینی ماہر اقتصادیات، دانشور اور سماجی کاروباری شخصیت ماؤیوشی (茅于轼) یہ بتاتے ہیں کہ بازار کس طرح ہم آہنگی اور تعاون کو فروغ دینے میں کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ تبادلہ کرنے والوں کے ذریعہ کم قیمتوں اور منافع کی تلاش کے فوائد کو اجاگر کرتے ہیں اور اس "خود غرضانہ" طرز عمل کو ان تنقیدی نظریات کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں جو سرمایہ داری کے مخالفین نے پیش کیے ہیں۔ وہ چین کے ادبی ورثے اور چین میں سرمایہ داری کے خاتمے کے تباہ کن تجربے کے دوران اپنی اور لاکھوں دوسرے چینی لوگوں کے تجربات سے مثالیں دیتے ہیں۔

ماؤیوشی بیجنگ، چین میں قائم یونی رول انسٹی ٹیوٹ (Unirule Institute) کے بانی اور چیئر مین ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں اور بہت سے علمی اور مقبول مضامین لکھے ہیں، کئی یونیورسٹیوں میں اقتصادیات پڑھائی ہے۔ انہوں نے چین میں پہلی غیر ریاستی خیراتی اداروں اور اپنی مدد آپ کے تحت آزاد تنظیموں میں سے کچھ قائم کیں، اور آزادی کے بہادر محافظ کے طور پر مشہور ہیں۔ 1950 کی دہائی میں انہیں یہ کہنے پر جبراً مشقت، جلاوطنی، "دوبارہ تعلیم" اور قریب بھوک کے ذریعے سزا دی گئی کہ: "اگر ہمارے پاس کہیں سے بھی سور کا گوشت خریدنے کی جگہ نہیں ہے، تو سور کے گوشت کی قیمتوں میں اضافہ ہونا چاہئے" اور "اگر

چیئرمین ماؤ کسی سائنس دان سے ملنا چاہتے ہیں، تو کس کو کس سے ملنے جانا چاہیئے؟" اور 2011 میں جب یہ کتاب شائع ہونے کے قریب تھی، انہوں نے 82 سال کی عمر میں ایک عوامی مضمون لکھا جو Caixin آن لائن میں شائع ہوا، جس کا عنوان تھا "ماؤ زے تونگ کو انسانی شکل میں واپس لانا (把毛泽东还原成人)"، اس مضمون کی بناء پر انہیں بے شمار جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں اور ایمانداری اور انصاف کی آواز کے طور پر ان کی شہرت میں اضافہ کیا۔ ماؤیوشی جدید دنیا کی عظیم آزادی پسند شخصیات میں سے ایک ہیں اور انہوں نے چین اور دنیا بھر میں حریت پسند خیالات اور آزادی کے تجربے کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے انتھک محنت کی ہے۔

شرفاء کی سرزمین میں مفادات کا تصادم

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے درمیان، چینی مصنف لی روژن (Li Ruzhen) نے ایک ناول لکھا جس کا عنوان تھا "آئینے میں پھول (Flowers in the Mirror)"۔ یہ کتاب ایک شخص تانگ آؤ (Tang Ao) کی کہانی بیان کرتی ہے جو کیریئر کی ناکامی کی وجہ سے اپنے بہنوئی کے ساتھ سمندر پار سفر پر جاتا ہے۔ سفر کے دوران وہ کئی مختلف ممالک کا دورہ کرتا ہے جن میں دلکش اور عجیب و غریب مناظر اور آوازیں ہوتی ہیں۔ وہ جس پہلے ملک میں جاتے ہیں وہ ہے "شرفاء کی سرزمین۔"

شرفاء کی سرزمین کے تمام باشندے جان بوجھ کر دوسروں کے فائدے کے لیے خود کو تکلیف دیتے ہیں۔ ناول کے گیارہویں باب میں ایک بیلیف (لی روژن یہاں جان بوجھ کر چینی کردار کا استعمال کرتا ہے جیسا کہ قدیم چین میں سمجھا جاتا تھا، جہاں بیلیف کو خصوصی مراعات

حاصل تھیں اور وہ اکثر عام لوگوں کو ستاتے تھے) کا ذکر ہے جو اشیاء خریدتے وقت درج ذیل صورتحال سے دوچار ہوتا ہے:

بیلیف نے کچھ سامان کا معائنہ کرنے کے بعد بیچنے والے سے کہا، "دوست، تمہارے پاس اتنا اعلیٰ معیار کا سامان ہے، پھر بھی تمہاری قیمت اتنی کم ہے۔ میں تمہارا فائدہ اٹھاتے ہوئے کس طرح مطمئن ہو سکتا ہوں؟ اگر تم قیمت نہیں بڑھاتے، تو تم ہمیں مزید تجارت کرنے سے روک دو گے۔"

> بیچنے والے نے جواب دیا: "میری دکان پر آپ کا آنا میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بیچنے والا آسمان کی حد تک قیمت مانگتا ہے اور خریدار زمین تک نیچے آتا ہے۔ میری قیمت آسمان تک ہے، لیکن تم اب بھی چاہتے ہو کہ میں اسے بڑھاؤں۔ میرے لیے یہ ماننا مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ کسی دوسری دکان سے سامان خریدنے جائیں۔"

بیچنے والے کے جواب کو سننے کے بعد بیلیف نے کہا: "تم نے اتنی اعلیٰ معیار کی اشیاء کے لیے کم قیمت لگائی ہے۔ کیا اس کا مطلب تمہارے لیے نقصان نہیں ہو گا؟ ہمیں دھوکہ دہی کے بغیر اور ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنا چاہیئے۔ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم سب کے اندر ایک اباکس (حسابی آلہ) ہوتا ہے؟" کچھ دیر بحث کے بعد بیچنے والے نے اصرار کیا کہ قیمت نہ بڑھائی جائے، جبکہ بیلیف نے غصے میں آکر وہ سامان آدھا ہی خریدا جو وہ پہلے خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جیسے ہی وہ جانے لگا بیچنے والے نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس موقع پر دو بزرگ مرد آئے جنہوں نے صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ بیلیف 80 فیصد سامان لے کر وہاں سے

چلا جائے۔

کتاب اگلے ایک اور لین دین کا ذکر کرتی ہے جس میں خریدار سمجھتا ہے کہ اشیاء کی طلب کی گئی قیمت بہت کم ہے کیونکہ معیار اعلیٰ ہے، جبکہ بیچنے والا اصرار کرتا ہے کہ اشیاء تازگی سے محروم ہیں اور انہیں معمولی سمجھا جانا چاہیے۔ آخر میں خریدار بیچنے والے کی خراب ترین اشیاء میں سے انتخاب کرتا ہے، جس سے قریب موجود بھیڑ اسے ناانصافی کا الزام دیتی ہے، لہٰذا خریدار اعلیٰ معیار کے ڈھیر میں سے آدھا اور کم معیار کے ڈھیر میں سے آدھا لیتا ہے۔ تیسرے لین دین میں دونوں فریق وزن اور چاندی کے معیار کا جائزہ لیتے ہوئے جھگڑا شروع کر دیتے ہیں۔ چاندی سے ادائیگی کرنے والا فریق سختی سے کہتا ہے کہ اس کی چاندی کا معیار خراب اور وزن ناکافی ہے، جبکہ چاندی وصول کرنے والا فریق کہتا ہے کہ چاندی اعلیٰ معیار اور وزن کی ہے۔ چونکہ ادائیگی کرنے والا فریق پہلے ہی جا چکا ہے، اس لیے وصول کنندہ فریق کو مجبوراً وہ چاندی جو وہ اضافی سمجھتا ہے، ایک غیر ملکی فقیر کو دینی پڑتی ہے۔

ناول میں دو اہم نکات اٹھائے گئے ہیں جنہیں مزید تلاش کرنا چاہیے۔

پہلا یہ ہے کہ جب دونوں فریق منافع میں اپنے حصے کو چھوڑنے یا یہ اصرار کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کا حصہ بہت زیادہ ہے، تو ایک بحث چھڑ جاتی ہے۔ حقیقی زندگی میں ہمیں جن جھگڑوں کا سامنا ہوتا ہے، ان میں سے زیادہ تر ہمارے اپنے مفادات کی پیروی سے جنم لیتے ہیں۔ نتیجتاً، ہم اکثر یہ غلطی کرتے ہیں کہ اگر ہم ہمیشہ دوسرے فریق کی طرفداری کریں گے تو ایسے تنازعات پیدا نہیں ہوں گے۔ لیکن "شرفاء کی سرزمین" میں، ہم دیکھ سکتے ہیں کہ

دوسروں کے مفادات کو اپنی فیصلوں کی بنیاد بنانا بھی تنازعات کا باعث بنتا ہے۔ تو نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں اب بھی ایک ہم آہنگ اور مربوط معاشرے کی منطقی بنیاد تلاش کرنی ہو گی۔

ہماری تحقیق میں ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقی دنیا کے کاروباری سودوں میں، لین دین کے دونوں فریق اپنا فائدہ تلاش کرتے ہیں، اور شرائط (جس میں قیمت اور معیار شامل ہیں) پر مذاکرات کے ذریعے دونوں فریق ایک معاہدے تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، "شرفاء کی سرزمین" میں ایسا معاہدہ ناممکن ہے۔ ناول میں مصنف کو ایک بوڑھے شخص اور ایک فقیر کی مدد لینی پڑتی ہے اور حتیٰ کہ جبر کا سہارا لینا پڑتا ہے تاکہ تنازعہ حل کیا جاسکے۔ یہاں ہمیں ایک گہری اور اہم حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے: وہ مذاکرات جن میں دونوں فریق اپنا ذاتی فائدہ تلاش کر رہے ہیں، توازن تک پہنچ سکتے ہیں، جبکہ اگر دونوں فریق ایک دوسرے کے مفادات کی تلاش میں ہوں تو وہ کبھی اتفاق رائے تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ مزید برآں، اس سے ایک ایسا معاشرہ پیدا ہو گا جو ہمیشہ خود سے متصادم ہو گا۔ یہ حقیقت زیادہ تر لوگوں کی توقعات کے خلاف جاتی ہے۔ چونکہ "شرفاء کی سرزمین" اپنے باشندوں کے درمیان تعلقات میں توازن قائم کرنے میں ناکام ہے، اس لیے آخرکار وہ "بے مروت اور کھردرے" لوگوں کی سرزمین میں بدل جاتی ہے۔ چونکہ "شرفاء کی سرزمین" دوسروں کے مفادات کا خیال رکھنے کی طرف مائل ہے، اس لیے یہ بدکردار لوگوں کی افزائش کا سبب بنتی ہے۔ جب شرفاء کسی تبادلے کو ختم کرنے میں ناکام رہتے ہیں، تو بے مروت اور کھردرے افراد اس حقیقت کو استعمال کرکے فائدہ اٹھاسکتے ہیں کہ شرفاء اپنے مفادات کو تباہ کرکے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر معاملات اسی طرح چلتے

رہے، تو شرفاء ممکنہ طور پر ختم ہو جائیں گے اور ان کی جگہ بے مروت اور کھر درے لوگ لے لیں گے۔

مندرجہ بالا نقطہ نظر سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انسان صرف اسی وقت تعاون کر سکتے ہیں جب وہ اپنے مفادات کی تلاش کرتے ہیں۔ یہی وہ مضبوط بنیاد ہے جس پر انسانیت ایک مثالی دنیا کی جستجو کر سکتی ہے۔ اگر انسانیت براہ راست اور خصوصی طور پر دوسروں کے فائدے کی تلاش کرتی، تو کوئی بھی مثالی صورت حال حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔

یقیناً، حقیقت کو بنیاد بناتے ہوئے تنازعہ کو کم کرنے کے لیے ہمیں اپنے ساتھی انسانوں کا خیال رکھنا چاہیے اور اپنے خود غرضانہ خواہشات کو قابو میں رکھنے کے طریقے تلاش کرنے چاہیے۔ لیکن اگر دوسروں کے مفادات کا خیال رکھنا تمام رویے کا مقصد بن جائے تو یہ وہی تنازعہ پیدا کرے گا جیسا کہ لی روژن نے "شرفاء کی سرزمین" میں بیان کیا ہے۔ شاید کچھ لوگ کہیں گے کہ "شرفاء کی سرزمین" میں زندگی کے مزاحیہ عناصر حقیقی دنیا میں نہیں ہو سکتے، لیکن جیسا کہ کتاب میں بتدریج واضح ہوتا ہے، حقیقی دنیا اور "شرفاء کی سرزمین" میں واقعات کی وجوہات ملتی جلتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، حقیقی دنیا اور "شرفاء کی سرزمین" دونوں میں ذاتی مفاد کی جستجو کے اصول کے بارے میں وضاحت کا فقدان ہے۔

شرفاء کی سرزمین کے باشندوں کے مقاصد کیا ہیں؟ ہمیں سب سے پہلے یہ پوچھنا چاہیے کہ "انسان تبادلہ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟" چاہے یہ ابتدائی بارٹر تبادلہ ہو یا جدید معاشرے میں کرنسی کے بدلے اشیاء کا تبادلہ، تبادلے کے پیچھے محرک اپنی حالت کو بہتر بنانا ہے، اپنی زندگی کو مزید آسان اور آرام دہ بنانا ہے۔ اگر یہ محرک نہ ہوں تو لوگ اپنی محنت سے کام کرنے کے

بجائے تبادلہ کا انتخاب کیوں کریں گے ؟ وہ تمام مادی لذتیں جو ہمیں سوئی دھاگے سے لے کر ریفریجریٹرز اور رنگین ٹی وی تک حاصل ہوتی ہیں، تبادلے کے ذریعے ہی دستیاب ہوتی ہیں۔ اگر لوگ تبادلہ نہ کریں تو ہر فرد صرف دیہی علاقوں میں اناج اور کپاس کی کاشت کر سکتا ہے، مٹی کے اینٹوں سے مکانات بنا سکتا ہے اور زمین سے اپنی ضروریات کی تمام چیزیں نکالنے کی جدوجہد کر سکتا ہے۔ اس طرح ایک شخص اپنے آباؤ اجداد کی طرح ہزاروں سالوں سے بمشکل گزارا کر سکتا ہے، لیکن ہم یقینی طور پر آج کی جدید تہذیب کے پیش کردہ فوائد سے لطف اندوز نہیں ہو سکیں گے۔

شرفاء کی سرزمین کے لوگ پہلے ہی ایک ریاست اور بازار رکھتے ہیں، جو ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے اقتصادی خود کفالت کو چھوڑ دیا ہے اور اس کے بجائے اپنے مادی حالات کو بہتر بنانے کے لیے تبادلے کے راستے کو اپنایا ہے۔ اس صورت میں جب وہ اقتصادی تبادلوں میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ اپنے مفادات کے بارے میں سوچنے سے انکار کیوں کرتے ہیں؟ یقیناً، اگر شروع سے تبادلے کا مقصد اپنے فائدے کو کم کرنا اور دوسروں کے فائدے کو فروغ دینا ہو تو "شریفانہ" رویہ ہو سکتا ہے۔ تاہم جیسا کہ کوئی بھی شخص جانتا ہے جو تبادلے میں شامل ہوتا ہے یا تبادلے کا تجربہ رکھتا ہے، تبادلے کے دونوں فریق اپنے فائدے کے لیے شامل ہوتے ہیں، جبکہ جو لوگ تبادلے کے دوران اپنے ذاتی مفاد کے خلاف کام کرتے ہیں وہ مقاصد کی عدم مطابقت کا شکار ہوتے ہیں۔

کیا قیمت کے مذاکرات کے بغیر باہمی فائدے پر مبنی معاشرہ قائم کرنا ممکن ہے؟

چین میں جب لی فینگ (Lei Feng) کی زندگی اور کارنامے کو فروغ دیا جا رہا تھا، تو اکثر ٹیلی ویژن پر لی فینگ کے عقیدت مند اور مہربان پیروکاروں کی تصاویر دیکھنے کو ملتی تھی جو لوگوں

کے لیے برتنوں کی مرمت کر رہے ہوتے تھے۔ اس کے بعد ایک لمبی قطار ان کے سامنے بنتی تھی، ہر شخص کے ہاتھ میں پرانے برتن ہوتے تھے جنہیں مرمت کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان تصاویر کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے لوگ لی فینگ کے اس مہربان پیروکار کی مثال کی پیروی کریں اور عوام کی توجہ اس پر مرکوز کریں۔ یہ بات نوٹ کریں کہ اگر ان کے سامنے لمبی قطار نہ ہوتی تو یہ پروپیگنڈا لوگوں کو قائل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ یہ بھی نوٹ کرنا چاہیے کہ جو لوگ قطار میں لگے تھے وہ لی فینگ سے سیکھنے کے لیے نہیں آئے تھے؛ بلکہ وہ دوسرے لوگوں کے خرچ پر اپنا فائدہ حاصل کرنے آئے تھے۔ حالانکہ ایسا پروپیگنڈا کچھ لوگوں کو دوسروں کے لیے اچھے کام کرنے کی تعلیم دے سکتا ہے، مگر اسی وقت یہ اور بھی زیادہ لوگوں کو یہ سکھاتا ہے کہ دوسروں کے کام سے ذاتی فائدہ کیسے حاصل کیا جائے۔ ماضی میں یہ خیال تھا کہ لوگوں کو بغیر معاوضہ کے دوسروں کی خدمت کرنے کی دعوت دینے والا پروپیگنڈا معاشرتی اخلاقیات کو بہتر بنا سکتا ہے۔ لیکن یہ یقیناً ایک بڑی غلط فہمی ہے، کیونکہ جو لوگ کسی قسم کا ذاتی فائدہ حاصل کرنے کا طریقہ سیکھیں گے، ان کی تعداد ان لوگوں سے کہیں زیادہ ہو گی جو دوسروں کی خدمت کے لیے کام کرنے کا طریقہ سیکھیں گے۔

معاشی فوائد کے نقطہ نظر سے دوسروں کی خدمت کے لیے ایک عمومی ذمہ داری فضول ہے۔ مفت مرمت کی پیشکش سے متوجہ ہونے والے لوگ اکثر ایسے خراب شدہ اشیاء لاتے ہیں جو دراصل مرمت کے قابل نہیں ہوتے، شاید ایسی اشیاء جو سیدھے کچرے سے نکالی گئی ہوں۔ لیکن چونکہ ان چیزوں کی مرمت کی قیمت اب صفر ہے، اس لیے ان کی مرمت میں لگنے والے قیمتی وقت اور مرمت کے لیے استعمال ہونے والے قیمتی سامان میں اضافہ ہو گا۔ چونکہ ان چیزوں کی مرمت کا بوجھ دوسروں کے کندھوں پر ہے، اس لیے مفت مرمت

حاصل کرنے والے عام شخص کے لیے واحد قیمت وہ وقت ہے جو قطار میں لگنے میں لگتا ہے۔ معاشرے کے نقطہ نظر سے، ان خراب شدہ چیزوں کی مرمت کے لیے استعمال ہونے والا سارا وقت، محنت اور سامان صرف کچھ مشکل سے قابل استعمال برتن فراہم کرے گا۔ اگر اس وقت اور مواد کو زیادہ پیداواری سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جائے تو یقیناً یہ معاشرے کے لیے زیادہ قدر پیدا کرے گا۔ معاشی کارکردگی اور مجموعی بہبود کے نقطہ نظر سے ایسا لازمی اور بغیر معاوضہ کے کئے جانے والا مرمت کا کام تقریباً اور یقیناً فائدے کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ ہے۔

اس کے علاوہ، اگر لی فینگ کے کسی اور مہربان طالب علم نے ایک ایسے شخص کی جگہ قطار میں کھڑا ہونے کی پیشکش کی جو برتن مرمت کروانے کے لیے مفت مرمت خدمات کا انتظار کر رہا ہے، تو اس طرح اس غریب شخص کو قطار میں لگنے کی تکلیف سے آزاد کر دیا جائے گا، تو ان لوگوں کی قطار جو اپنی اشیاء کی مرمت کروانے کا انتظار کر رہے ہیں، مزید لمبی ہو جائے گی۔ یہ واقعی ایک مضحکہ خیز منظر ہو گا، جس میں ایک گروپ قطار میں کھڑا ہو تا کہ دوسرا گروپ نہ کھڑا ہو سکے۔ اس طرح کے فرض کا نظام پہلے سے ہی خدمت کرنے کے لیے تیار ایک گروپ کی موجودگی کو فرض کرتا ہے۔ اس طرح کی خدمت کی اخلاقیات کو عالمی سطح پر نہیں اپنایا جا سکتا۔ ظاہر ہے، جو لوگ بغیر قیمتوں کے باہمی خدمت کے اس طرح کے نظام کی برتری کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں، انہوں نے اس پر غور نہیں کیا ہے۔

دوسروں کی اشیاء کی مرمت کرنے کا فرض ایک اضافی غیر متوقع نتیجہ رکھتا ہے۔ اگر لی فینگ کے طالب علموں کی وجہ سے مرمت کے کاروبار سے وابستہ لوگ اپنی جگہ کھو دیتے ہیں، تو وہ اپنی ملازمتیں کھو دیں گے اور مشکلات کا سامنا کریں گے۔

میں لی فینگ کی تعلیم کے مطالعے کی مخالفت نہیں کرتا، کیونکہ اس نے ضرورت مندوں کی مدد کی، جو معاشرے کے لیے ایک مثبت حتیٰ کہ ضروری سرگرمی ہے۔ تاہم، دوسروں کی خدمت کی ضرورت کو لازمی قرار دینے سے عدم مطابقت اور بے ترتیبی پیدا ہوتی ہے اور لی فینگ کی رضاکارانہ خدمت کے جذبے کو بگاڑ دیتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ خاصے بدگمان ہیں اور ان کو ایک ایسے معاشرے سے نفرت ہے جو ان کے خیال میں پیسے کو سب سے بلند مقام دیتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ جن کے پاس پیسہ ہوتا ہے وہ ناقابل برداشت ہوتے ہیں اور امیر لوگ خود کو باقی معاشرے سے اوپر سمجھتے ہیں، جبکہ غریب انسانیت کی خاطر مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ پیسہ انسانوں کے درمیان معمول کے تعلقات کو بگاڑ دیتا ہے۔ نتیجتاً، وہ ایک ایسا معاشرہ تخلیق کرنے کی خواہش رکھتے ہیں جو باہمی خدمت پر مبنی ہو، جہاں پیسے اور قیمتوں کا ذکر نہ ہو۔ وہ ایک ایسا معاشرہ چاہتے ہیں جہاں کسان بغیر کسی انعام کے اناج اگائیں؛ جہاں مزدور بغیر کسی معاوضے کے سب کے لیے کپڑے بنائیں؛ جہاں حجام مفت میں بال کاٹیں؛ وغیرہ۔ کیا ایسا مثالی معاشرہ عملی ہو سکتا ہے؟

جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں وسائل کی تقسیم کے معاشی نظریے کی طرف رجوع کرنا ہوگا، جس کے لیے ایک طویل وضاحت درکار ہوگی۔ اسے آسان بنانے کے لیے، ہم ایک خیالی تجربے سے شروع کرسکتے ہیں۔ ایک حجام کا تصور کریں۔ اس وقت، مرد ہر تین سے چار ہفتوں میں بال کٹواتے ہیں، لیکن اگر بال کٹوانا مفت ہوتا، تو شاید وہ ہر ہفتے حجام کے پاس جاتے۔ بال کٹوانے کے لیے پیسے چارج کرنا حجام کی محنت کو بہتر طریقے سے استعمال کرتا ہے۔ بازار میں، حجام کی خدمات کی قیمت طے کرتی ہے کہ معاشرے کی محنت کا کتنا حصہ اس پیشے کے

لیے وقف ہو گا۔ اگر حکومت بال کٹوانے کی قیمت کم رکھے، تو بال کٹوانے والوں کی تعداد بڑھ جائے گی، اور اس کے مطابق، حجاموں کی تعداد بھی بڑھانی پڑے گی اور دیگر ملازمتوں میں کمی کرنی پڑے گی اگر کل مزدوروں کی تعداد ایک جیسی رکھی جائے۔ جو بات حجاموں پر صادق آتی ہے وہ دیگر پیشوں پر بھی لاگو ہوتی ہے۔

چین کے کئی دیہی علاقوں میں مفت خدمات کی پیشکش کافی عام ہے۔ اگر کوئی نیا گھر بنانا چاہتا ہے تو ان کے رشتہ دار اور دوست تعمیر میں مدد کرنے آتے ہیں۔ عام طور پر اس کے بدلے میں کوئی ادائیگی نہیں کی جاتی، سوائے ان تمام لوگوں کے لیے ایک بڑے کھانے کے جو مدد کرتے ہیں۔ جب فائدہ اٹھانے والے کا کوئی دوست اگلی بار نیا گھر بناتا ہے تو وہ پہلے فائدہ اٹھانے والا مفت مزدوری کی پیشکش کرتا ہے تاکہ ادائیگی ہو سکے۔ مرمت کرنے والے اکثر بجلی کے آلات بغیر چارج کیئے ٹھیک کر دیتے ہیں، چینی صرف نئے سال کی چھٹی کے دوران ایک تحفے کی توقع کرتے ہیں۔ ایسے غیر مالی تبادلے خدمات کی قدر کو صحیح طریقے سے نہیں ناپ سکتے۔ نتیجتاً محنت کی قدر کو مؤثر طریقے سے فروغ نہیں دیا جاتا اور معاشرے میں محنت کی تقسیم کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ پیسہ اور قیمتیں معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کسی کو بھی محبت اور دوستی جیسے جذبات کو پیسے سے تبدیل کرنے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محبت اور دوستی پیسے کی جگہ لے سکتی ہیں۔ ہم پیسے کو اس لیے ختم نہیں کر سکتے کہ ہمیں ڈر ہے کہ یہ انسانی جذبات کے رشتوں کو ختم کر دے گا۔ درحقیقت پیسوں میں ظاہر کی گئی قیمتیں واحد طریقہ ہیں جو یہ طے کرتی ہیں کہ وسائل کو ان کے سب سے زیادہ قیمت والے استعمالات کے لیے کیسے مختص کیا جائے۔ اگر ہم مالی

قیمتوں اور اپنے اعلیٰ جذبات اور اقدار دونوں کو برقرار رکھیں تو ہم ایک ایسا معاشرہ بنانے کی امید رکھ سکتے ہیں جو مؤثر اور انسانیت نواز ہو۔

ذاتی مفادات کا توازن

فرض کریں کہ A اور B کو دو سیب تقسیم کرنے ہیں تاکہ وہ انہیں کھا سکیں۔ A پہلے بڑا سیب اٹھاتا ہے۔ B نے تلخی سے A سے پوچھا، "تم اتنے خود غرض کیسے ہو سکتے ہو؟" جس پر A نے جواب دیا، "اگر تم پہلے سیب اٹھاتے، تو کون سا انتخاب کرتے؟ B "نے جواب دیا، "میں چھوٹا سیب اٹھاتا۔ A نے ہنستے ہوئے جواب دیا، "اگر ایسا ہے، تو میرے انتخاب کا طریقہ تمہاری خواہشات کے مطابق ہے۔"

اس صورت میں، A نے B کا فائدہ اٹھایا، کیونکہ " B دوسروں کے مفادات کو اپنے مفادات پر فوقیت دینے" کے اصول کی پیروی کر رہا تھا، جبکہ A نے ایسا نہیں کیا۔ اگر صرف ایک طبقہ اس اصول کی پیروی کرتا ہے جبکہ باقی نہیں کرتے، تو پہلا طبقہ یقینی طور پر نقصانات اٹھائے گا، جبکہ دوسرا طبقہ فائدہ اٹھائے گا۔ اگر یہ بغیر کسی روک ٹوک کے جاری رہے، تو اس کا نتیجہ تصادم کی صورت میں نکلے گا۔ واضح ہے کہ اگر صرف کچھ لوگ دوسروں کے مفادات کو اپنے مفادات پر ترجیح دیتے ہیں، تو آخر کار یہ نظام صرف تصادم اور بدامنی پیدا کرے گا۔ اگر دونوں A اور B دوسرے فریق کے مفادات کو دیکھیں، تو اوپر بیان کردہ سیب کا مسئلہ حل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ چونکہ دونوں چھوٹے سیب کو کھانے کی کوشش کریں گے، ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گا، جیسے کہ ہم نے شرفاء کی سرزمین میں دیکھا۔ جو کچھ A اور B کے بارے میں ہے، وہ سب کے بارے میں بھی سچ ہے۔ اگر پورا معاشرہ، ایک شخص کو چھوڑ کر،

دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے اصول کی پیروی کرے، تو تمام معاشرہ اس شخص کی خوشی کے تحت خدمت کرے گا؛ منطقی طور پر ایسا نظام ممکن ہو گا۔ لیکن اگر وہ شخص بھی دوسروں کی خدمت کے اصول کو اپنانا شروع کر دے، تو معاشرہ ایک معاشرہ کے طور پر یعنی تعاون کے نظام کے طور پر ختم ہو جائے گا۔ دوسروں کی خدمت کا اصول عام طور پر اس شرط پر قابل عمل ہے کہ پورے معاشرے کے مفادات کو دوسروں کے سپرد کیا جا سکے۔ لیکن پوری دنیا کے نقطہ نظر سے، یہ ناممکن ہو گا جب تک کہ زمین کی آبادی کے مفادات کی دیکھ بھال کا ذمہ چاند کو نہیں سونپ دیا جاتا۔

اس عدم مطابقت کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے کے مجموعی نقطہ نظر سے "دوسروں" اور "خود" میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ظاہر ہے، کسی مخصوص جان یا جین ڈو کے لیے، "خود" "خود" ہے، جبکہ "دوسرے" "دوسرے" ہیں، اور پہلا دوسرے سے متشابہ نہیں ہونا چاہیے۔ تاہم، معاشرتی نقطہ نظر سے ہر شخص ایک ہی وقت میں "خود" اور "دوسرا" ہوتا ہے۔ جب "دوسروں کی خدمت کرنے سے پہلے خود کی خدمت" کا اصول شخص A پر لاگو ہوتا ہے، تو شخص A کو پہلے دوسروں کے فوائد اور نقصانات پر غور کرنا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہی اصول شخص B پر اپنایا جاتا ہے، تو شخص A وہ شخص بن جاتا ہے جس کا مفاد بنیادی سمجھا جاتا ہے۔ ایک ہی معاشرے کے اراکین کے لیے سوال یہ ہے کہ آیا انہیں دوسروں کے مفادات پہلے سوچنے چاہئیں، یا دوسروں کو انہیں پہلے سوچنا چاہیے، جو براہ راست الجھن اور تضاد کو جنم دیتا ہے۔ لہذا، اس سیاق و سباق میں بے لوثی کا اصول منطقی طور پر ہم آہنگ نہیں، متضاد ہے۔ اور اس لیے انسانی تعلقات میں آنے والے مسائل کو حل کرنے کے لیے مؤثر نہیں ہو سکتا۔ یقیناً، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان اصولوں کے پیچھے جو روح ہے، وہ کبھی سراہنے کے

لائق نہیں ہے، یا کہ ایسا دوسروں کا خیال رکھنے والا برتاؤ قابل ستائش نہیں ہے، بلکہ یہ معاشرے کے اراکین کے باہمی مفاد کو محفوظ کرنے کے لیے ایک عالمی بنیاد فراہم نہیں کر سکتا۔

جنہوں نے ثقافتی انقلاب کے دوران زندگی گزاری ہے، وہ یاد رکھیں گے کہ جب "خود غرضی کے خلاف جدوجہد، اصلاح پسندی پر تنقید(Struggle Against Selfishness, Criticize Revisionism)"(dousi pixiu)کا نعرہ ملک بھر میں گونج رہا تھا، تو سازشیوں اور کیریئر پرستوں کی تعداد اپنے عروج پر تھی۔ اُس وقت، چین کے اکثر عام لوگ(laobaixing)واقعی یقین کرتے تھے کہ "خود غرضی کے خلاف جدوجہد، اصلاح پسندی پر تنقید" ایک معاشرتی اصول بن سکتا ہے اور نتیجتاً، انہوں نے اس کی سختیوں کی پیروی کرنے کی پوری کوشش کی۔ اسی دوران موقع پرستوں نے اس نعرے کو دوسروں کا فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے استحصال کے خلاف مہم کا بہانہ بنا کر دوسروں کے گھروں پر چھاپے مارے اور دوسروں کی املاک کو اپنی جیبوں میں ڈالا۔ انہوں نے دوسروں سے کہا کہ خود غرضی کو ختم کریں اور انقلاب کی خاطر یہ تسلیم کریں کہ وہ غدار، جاسوس، یا مخالف انقلاب ہیں، اور یوں اپنے ریکارڈ میں ایک مزید نکتہ شامل کریں۔ بغیر سوچے سمجھے، صرف اپنے لیے ایک سرکاری عہدہ حاصل کرنے کی کوشش میں ایسے موقع پرست دوسروں کو ایسی حالت میں ڈال دیتے جہاں ان کی زندگیوں کو خطرہ ہوتا۔ اب تک ہم نے "دوسروں کی خدمت کرنے سے پہلے خود کی خدمت" کے اصول کے نظریاتی مسائل کا تجزیہ کیا ہے، لیکن ثقافتی انقلاب کی تاریخ اس اصول کے عملی نفاذ میں مزید تضاد کو ثابت کرتی ہے۔

ثقافتی انقلاب ماضی کی یادوں میں مدہم ہو چکا ہے، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اُس وقت تمام نعروں کو تنقید اور جانچ پڑتال کا سامنا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے، کیونکہ معاشرتی مسائل کے حل کے لیے سب سے بہتر اصول کون سا ہے، اس سوال کو جانچنے سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ ہم اب بھی اکثر پرانے پراپیگنڈوں کا استعمال کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اختلافات حل کرنے پر اُکسایا جائے، اور یہاں تک کہ جب مقدمات عدالت میں سنے جاتے ہیں، تو ان پرانے طریقوں کا ابھی بھی کافی اثر ہے۔

جو قارئین خیالی تجربات میں ماہر ہیں، وہ یقیناً اوپر ذکر کردہ مسئلے کے بارے میں اضافی سوالات کریں گے کہ دو افراد کے درمیان سیبوں کی تقسیم کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ اگر ہم متفق ہیں کہ "دوسروں کی خدمت کرنے سے پہلے خود کی خدمت" قاعدے کے طور پر دو سیبوں کی تقسیم کے مسئلے کو حل نہیں کر سکتا، تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنے کا کوئی بہتر طریقہ نہیں ہے؟ یاد رکھیں کہ ایک چھوٹا سیب اور ایک بڑا سیب ہے اور صرف دو افراد تقسیم میں حصہ لے رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ حتیٰ کہ افسانوی چینی امراء بھی ایک مناسب حل تیار کرنے میں ناکام رہیں؟ تبادلے کے معاشرے میں اوپر ذکر کردہ مسئلہ واقعی قابل حل ہے۔ دونوں افراد پہلے ایک دوسرے سے مشورہ کر سکتے ہیں تاکہ مخمصے کو حل کیا جا سکے۔ مثلاً، فرض کریں کہ A بڑا سیب منتخب کرتا ہے اس شرط پر کہ B کو اگلی بار جب وہ ملیں گے تو بڑا سیب لے جانے کا حق ہو؛ یا اگر A بڑے سیب کے بدلے میں B کو کسی قسم کا معاوضہ ملتا۔ ادائیگی اس مشکل کو حل کرنے میں مدد کرے گی۔ ایک معیشت میں جو پیسے کا استعمال کرتی ہے، وہاں یقیناً ایسی پارٹیاں ہوں گی جو اس طریقے کو اپنانے کے لیے تیار ہوں گی۔ ایک چھوٹے معاوضے (مثلاً ایک سینٹ) کی پیشکش سے شروع کرتے ہوئے، رقم کو

بتدریج بڑھایا جا سکتا ہے یہاں تک کہ دوسری پارٹی چھوٹے سیب کے ساتھ معاوضہ قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اگر ابتدائی رقم بہت چھوٹی ہو، تو ہم فرض کر سکتے ہیں کہ دونوں پارٹیاں بڑے سیب کو لے کر چھوٹے سیب کے بدلے چھوٹا معاوضہ ادا کرنے کو ترجیح دیں گی۔ جیسے جیسے معاوضہ بڑھتا جائے گا، یہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے گا جہاں دونوں میں سے کوئی ایک چھوٹے سیب کے ساتھ معاوضہ قبول کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر دونوں پارٹیاں عقل مندی سے مسئلے کا تجزیہ کریں، تو وہ تنازعہ کو حل کرنے کا طریقہ تلاش کر لیں گی۔ اور یہی دونوں فریقوں کے متضاد مفادات کو پرامن طریقے سے حل کرنے کا طریقہ ہے۔

چین کی اصلاحات اور افتتاح کے تیس سال بعد، دولت اور غربت کا مسئلہ ایک بار پھر اٹھایا گیا ہے، اور امیروں کے خلاف دشمنی ہر دن بڑھ رہی ہے۔ جب طبقاتی جدوجہد پر زور دیا جاتا تھا، ہر بڑے تحریک کے آغاز پر ماضی کی تکلیفوں کو حال کی خوشیوں کے ساتھ موازنہ کیا جاتا تھا۔ پچھلی سوسائٹی کی مذمت کی جاتی تھی اور ماضی کے استحصال کو لوگوں کی نفرت کو متحرک کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جب 1966 میں ثقافتی انقلاب شروع ہوا (جو پرانے طبقاتی نظام کی برائیوں کو ختم کرنے کی تحریک تھی)، بہت سے علاقوں میں جاگیردار طبقے کے نسلوں کو زندہ دفن کر دیا گیا، حالانکہ زیادہ تر جاگیردار پہلے ہی مر چکے تھے۔ کسی کو بھی نہیں بخشا گیا: نہ بزرگوں کو، نہ جوانوں کو، اور نہ ہی عورتوں اور بچوں کو۔ لوگ کہتے تھے کہ جیسے محبت بغیر سبب کے نہیں ہوتی، ویسے ہی نفرت بھی بغیر وجہ کے نہیں ہوتی۔ جاگیردار طبقے کے بچوں کے خلاف یہ دشمنی کی روح کہاں سے آئی؟ یہ اس پختہ یقین سے آئی کہ جاگیردار طبقے کے نسلوں نے دنیا میں اپنے مقام کو بنانے کے لیے استحصال پر انحصار کیا تھا۔ آج، امیر اور

غریب کے درمیان فرق مزید واضح ہو چکا ہے۔ اور اگرچہ کچھ لوگ غیر قانونی طریقوں سے دولت حاصل کرتے ہیں، کسی بھی سوسائٹی میں امیر اور غریب کے درمیان فرق ایک ناقابلِ گریز حقیقت ہے۔ یہاں تک کہ ترقی یافتہ ممالک میں جہاں غیر قانونی راستے سختی سے محدود ہیں، امیر اور غریب کے درمیان فرق عام طور پر موجود ہوتا ہے۔

امیروں کے خلاف ناپسندیدگی یا ناراضگی کی منطق غلط ہے۔ اگر کوئی امیروں سے بدلہ لینے کے لئے ناراض ہے کیونکہ وہ خود امیر نہیں ہوا، تو سب سے بہتر حکمت عملی یہ ہوگی کہ پہلے امیروں کا تختہ الٹ دیا جائے، اور پھر انتظار کیا جائے جب تک کہ خود دولت مند نہ ہو جائے، اور اس کے بعد امیروں کے حقوق کی حفاظت کی وکالت کی جائے۔ ایک مخصوص گروپ کے لیے یہ واقعی سب سے معقول راستہ ہو سکتا ہے۔ لیکن پوری سوسائٹی کے لیے اس عمل کو ہم آہنگ کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے تاکہ سوسائٹی کے تمام اراکین ایک ہی رفتار سے دولت مند ہو سکیں۔ کچھ افراد دوسروں سے پہلے دولت مند ہو جائیں گے؛ اگر ہم انتظار کریں کہ سب ایک ہی شرح سے دولت مند ہوں، تو کوئی بھی دولت حاصل نہیں کر سکے گا۔ امیروں کی مخالفت بلاجواز ہے، کیونکہ غریبوں کو امیر بننے کا موقع صرف اسی صورت میں ملے گا جب ان حقوق کی ضمانت دی جائے جو ہر کسی کو دولت حاصل کرنے کی اجازت دیتے ہیں؛ اگر کسی کی محنت کے ثمرات کی خلاف ورزی نہ کی جائے اور اگر جائیداد کے حق کا احترام کیا جائے۔ ایک معاشرہ جس میں زیادہ سے زیادہ افراد دولت حاصل کریں اور "دولت مند ہونا فخر کی بات ہے" پر متفق ہوں، درحقیقت وہ کچھ ہے جسے بنایا جا سکتا ہے۔

چینی اسکالر لی منگ (Li Ming) نے ایک بار لکھا تھا کہ لوگوں کو دو گروپوں "امیر" اور "غریب" میں تقسیم کرنا دونوں کے درمیان فرق کرنے کا غلط طریقہ ہے۔ بلکہ یہ ہونا چاہیے

کہ حقوق والے اور حقوق سے محروم۔ ان کا مطلب تھا کہ جدید سوسائٹی میں امیر اور غریب کا سوال دراصل حقوق کا سوال ہے۔ امیر اس لیے امیر بنے ہیں کیونکہ ان کے پاس حقوق ہیں، جبکہ غریبوں کے پاس حقوق نہیں ہیں۔ ان کے حقوق سے مراد انسانی حقوق ہونے چاہییے، نہ کہ خصوصی مراعات۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تمام شہریوں کو خصوصی مراعات تک رسائی ہو۔ صرف ایک چھوٹا اقلیتی گروپ مراعات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر ہم امیر اور غریب کے سوال کو حل کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں پہلے تمام افراد کے لیے مساوی انسانی حقوق قائم کرنے چاہییے۔ لی منگ کا تجزیہ گہرا اور جامع ہے۔

مارکیٹ سوسائٹی میں مساوات
اور
عدم مساوات کی اخلاقی منطق

تحریر: لیونڈِوی. نیکونوو
(Leonid V. Nikonov)

اس مضمون میں روسی فلسفی لیونڈِ نیکونوو "برابری" کے خیال کو تنقیدی جائزے کے لیے پیش کرتے ہیں اور اخذ کرتے ہیں کہ سرمایہ داری کے خلاف بیشتر تنقید جو برابری کے دعووں پر مبنی ہیں، چاہے ابتدائی صلاحیتوں، اقدار، یا نتائج کے بارے میں ہوں، نا قابلِ فہم ہیں۔

لیونڈِ نیکونوو روسی فیڈریشن میں الٹائی اسٹیٹ یونیورسٹی بارنوئل میں فلسفے کے لیکچرر ہیں، جہاں وہ سماجی فلسفہ، وجودیات، علم کا نظریہ، اور مذہب کی فلسفے پر کورسز پڑھاتے ہیں۔ وہ فی الحال "لبرل ازم کی اخلاقی قدریں(Moral Measurements of Liberalism)" پر ایک کتاب پر کام کر رہے ہیں اور اسے کئی روسی علمی جریدوں میں شائع کر چکے ہیں۔ 2010 میں انہوں نے "فلسفے کی آزادی کا مرکز(Center for the Philosophy of Freedom)" قائم کیا اور اس کے ڈائریکٹر بنے، جو روس اور قازقستان میں کانفرنسیں، مباحثوں کے مقابلے اور دیگر پروگرامز منعقد کرتا ہے۔ ان کی اس کام میں دلچسپی اس وقت مزید بڑھی جب انہوں نے 2007 میں روسی زبان میں "عالمی سرمایہ داری اور انسانی آزادی (Global Capitalism and Human Freedom)" کے عنوان مضمون نویسی کے مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس طرح کا ایک مقابلہ 2011 میں سٹوڈنٹس فار لبرٹی کے مالی معاونت سے منعقد ہوا تھا، اور یوکرین کے الوشتا میں آزادی پر گرمیوں کے اسکول میں شرکت کی۔ (اس پروگرام کو اس وقت Cato.ru کے نام سے منظم کیا گیا تھا، اور اب

InLiberty.ru ہے)۔ 2011 میں انہیں مونٹ پیلرین سوسائٹی(Mont Pelerin Society) میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی، جو 1947 میں 39 محققین نے کلاسیکی لبرل خیالات کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے قائم کی تھی، اور وہ اس کے سب سے کم عمر رکن بنے۔

مارکیٹس لازمی طور پر مساوی نتائج پیدا نہیں کرتیں، اور نہ ہی انہیں مساوی ابتدائی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مارکیٹ کے ہونے کی ایک قابل افسوس قیمت نہیں ہے۔ عدم برابری صرف مارکیٹ کے تبادلے کا ایک معمولی نتیجہ نہیں ہے۔ یہ تبادلے کی ایک پیشگی شرط ہے، جس کے بغیر تبادلہ بے معنی ہو جائے گا۔ یہ توقع کرنا کہ مارکیٹ کے تبادلے اور اس کے نتیجے میں وہ سماج جہاں دولت مارکیٹ کے ذریعے مختص کی جاتی ہے، برابری پر منتج ہوں گے، مضحکہ خیز ہے۔ آزاد مارکیٹس کے لیے مساوی بنیادی حقوق، بشمول تبادلے کی مساوی آزادی ضروری ہیں لیکن آزاد مارکیٹس سے مساوی نتائج کی توقع نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی یہ قانونی حقوق کے علاوہ دیگر حالات کی برابری پر منحصر ہیں۔

برابر کے تبادلے کا آئیڈیل ابتدائی صلاحیتوں کی برابری یا نتائج کی برابری کی طرف اشارہ کر سکتا ہے۔ اگر پہلے معنوں میں کہا جائے تو صرف وہ فریق جو ہر متعلقہ پہلو میں برابر ہیں، مساوی تبادلے میں شامل ہو سکتے ہیں؛ کوئی بھی فرق تبادلے کو غیر مساوی بنا دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ اسے بنیادی طور پر غیر مساوی (اور اس طرح غیر منصفانہ) لیبر معاہدوں کے طور پر مسترد کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر معنی میں اس کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ مساوی قدروں کا تبادلہ ہو یا یہ کہ تبادلے کے نتائج قدر میں برابر ہوں۔ مثال کے طور پر، اگر ایک ہی مقدار میں ایک ہی معیار کی اشیاء ایک فریق سے دوسرے فریق کو منتقل کی جائیں، تو تبادلہ برابری کی

شرائط کو پورا کرے گا۔ ایک حقیقت پسندانہ منظر کا تصور کریں جہاں دو انسان نما، ایک دوسرے کی طرح مکمل طور پر (یعنی ذاتی اختلافات سے خالی جو عدم برابری کی بنیاد ہوتے ہیں)، ایک دوسرے کے درمیان بالکل ایک جیسی چیزیں منتقل کرتے ہیں۔ کسی بھی جمالیاتی کراہیت کو ایک طرف رکھتے ہوئے جو ہم اس غیر فطری تصویر پر محسوس کر سکتے ہیں، عام عقل خود ہی یہ تجویز کرنی چاہیے کہ برابر کے تبادلے کا خیال بنیادی تضاد پر منحصر ہے۔ ایسا تبادلہ کچھ نہیں بدلے گا؛ یہ کسی بھی فریق کی حالت کو بہتر نہیں کرے گا، یعنی کوئی بھی فریق ایسا تبادلہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں رکھے گا۔ (کارل مارکس نے اصرار کیا ہے کہ مارکیٹ میں تبادلے برابری کی قیمتوں پر مبنی تھے، جس نے ایک بے معنی اور غیر متوازن اقتصادی نظریہ پیدا کیا۔) مارکیٹ کے تبادلے کو برابری کے اصول پر مبنی کرنا تبادلے کو اس کی بنیادی وجہ سے محروم کر دیتا ہے، جو کہ دونوں فریقوں کو بہتر حالت میں لانا ہے۔ تبادلے کی معاشیات کا انحصار تبادلے کرنے والے فریقین کی طرف سے اشیاء یا خدمات کی غیر مساوی قیمت کو تسلیم کرنے پر منحصر ہے۔

تاہم، اخلاقی اعتبار سے برابری کا خیال کچھ لوگوں کے لیے دلکش ہو سکتا ہے۔ بہت سے اخلاقی فیصلوں کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ خالصتاً واجبی طریقے سے ترتیب دیئے جاتے ہیں، یعنی وہ صرف فرائض کے منطق پر مبنی ہوتے ہیں۔ معاشیات کی منطق کی پرواہ کیے بغیر، جو کچھ موجود ہے یا حتیٰ کہ جو موجود ہوگا اس کی پرواہ کیے بغیر وہ صرف اس بات کی فکر کرتے ہیں کہ کیا کیا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر، امینوئل کانٹ کے مطابق، ایک فرض اپنے عمل درآمد کا مطالبہ کرتا ہے، نتائج، اثرات اور یہاں تک کہ ان امکانات سے قطع نظر کہ کیا کیا جانا چاہیے۔ کہنا کہ آپ کو کرنا چاہیے، یہ کہنے کے مترادف ہے کہ آپ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا، یہاں

تک کہ اگر تبادلے میں ایسی برابری معاشی طور پر بے معنی ہے، تو پھر بھی (اور ہے) اسے ایک اخلاقی مثالی کے طور پر برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

برابری کو ایک اخلاقی مسئلے کے طور پر سمجھنا ایک بہت پیچیدہ معاملہ ہے۔ ہم ان نقطہ نظر کے درمیان فرق کرسکتے ہیں جن کے لیے برابری کا حصول غالب تشویش ہے اور ان کے لیے نہیں ہے؛ اس کے مطابق، سابق کو مساوات پسندانہ نقطہ نظر اور بعد کو غیر مساوات پسندانہ نقطہ نظر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ غیر مساوات پسندانہ نقطہ نظر نہ تو ضروری طور پر برابری کی ناپسندیدگی کا دعویٰ کرتے ہیں، نہ ہی عدم مساوات کی مطلوبیت کا دعویٰ کرتے ہیں؛ وہ صرف برابری کو ایک مقصد کے طور پر دوسرے مقاصد کے اخراج کے ساتھ خصوصی مساوات پسندانہ توجہ کو مسترد کرتے ہیں، خاص طور پر مادی دولت کی برابری کو یقینی بنانے پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ کلاسیکی لبرل (یا آزادانہ) غیر مساوات پسندانہ افراد ایک خاص قسم کی برابری کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، یعنی بنیادی حقوق کی برابری، جسے وہ نتائج کی برابری کے ساتھ متضاد سمجھتے ہیں، لہذا انہیں مختلف قسم کے مساوات پسند سمجھا جاسکتا ہے۔ (حقوق کی برابری بہت سے تجربات جیسے قانون، جائیداد، اور برداشت کی بنیاد ہے جسے جدید اور آزاد معاشروں میں لوگ معمول کے طور پر قبول کرتے ہیں۔) غیر مساوات پسندانہ آزاد خیال اور کلاسیکی لبرل اپنے نقطہ نظر کو برابری کی سب سے خالص، سب سے زیادہ مستقل یا سب سے زیادہ پائیدار شکل کے طور پر دفاع کرتے ہیں، لیکن دولت کی تقسیم کی برابری کے حامی عام طور پر دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسی آزادانہ برابری صرف رسمی ہے، الفاظ میں برابری ہے، عمل میں نہیں۔ (اس میں وہ ایک نکتہ رکھتے ہیں، کیونکہ قانونی برابری کا تعلق اس بات سے ہے کہ لوگ کیا سوچتے ہیں اور وہ کیسے عمل کرتے ہیں، اس کی بجائے کہ دنیا کی قابلِ بیان حالتیں یا

اثاثوں کی جامد تقسیم کیسی ہیں۔ کیا برابری کا یہ نقطہ نظر صرف رسمی ہے، یا حقیقی، یہ اس بات پر منحصر ہے کہ قانونی طریقہ کار اور رویوں کے معیار کی اہمیت کو کیسے دیکھا جائے۔)

یہ غیر معمولی بات نہیں ہے کہ مشکل فلسفیانہ سوالات کو فعال طور پر اس سے پہلے بحث کیا جائے کہ وہ واضح طور پر ترتیب دیے جائیں یا صحیح طریقے سے اٹھائے جائیں۔ مشرق اور مغرب کے فلسفیوں نے اس سے پہلے کہ ذمہ داریوں اور کارکردگی کی منطق کے بارے میں فیصلوں کا کوئی منظم تجزیہ ہو، ہزاروں سالوں سے اخلاقی اصولوں کو پیش کئے۔ اس کام کا آغاز ڈیوڈ ہیوم (David Hume) نے کیا تھا اور بعد میں امینوئل کانٹ(Immanuel Kant)اور بعد میں مثبت فلسفیوں جیسے جارج مور، الفریڈ آئر، رچرڈ ہیر اور دوسروں نے کیا؛ کارکردگی کی بنیاد اور واجبی منطق کی تحقیق جاری ہے۔ اگرچہ مساوات پسندانہ اور غیر مساوات پسندانہ موقف کے درمیان تنازعہ محض برابری اور اخلاقیات کے درمیان مناسب منطقی تعلق پر غور کرنے تک محدود نہیں ہے، برابری اور اخلاقیات کے درمیان تعلق کو سمجھنا اس جاری اور شدید بحث میں ایک اہم شراکت ہوگی کہ آیا مارکیٹ کے تبادلے سے پیدا ہونے والی نابرابری کو زبردستی دوبارہ تقسیم کرنا اخلاقی طور پر ضروری ہے یا اخلاقی طور پر ممنوع ہے۔ (یہ اس بات سے بالکل الگ مسئلہ ہے کہ آیا ریاستوں کے حکمرانوں یا "آزادانہ" مجرموں کے ذریعہ حق کے مالکوں سے چوری کئے گئے وسائل کو ان لوگوں کو واپس کرنا چاہیے جو محروم ہوئے تھے۔)

آیئے برابری کی اخلاقیات کے مسئلے کو ایک سادہ سوال کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں: کیوں ابتدائی اختیارات یا نتائج کی برابری عدم مساوات کے مقابلے میں اخلاقی لحاظ سے

برتر ہے (یا اس کے برعکس)؟ اس تنازعے کے اخلاقی حل تک پہنچنے کی ایک مخلصانہ کوشش کا تقاضا ہے کہ اس طرح کا براہ راست سوال مساوات پسندانہ اور غیر مساوات پسندانہ دونوں سے پوچھا جائے۔

ممکنہ جوابات کی حد محدود ہے۔ کوئی بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کر سکتا ہے کہ کچھ عددی تناسب (برابری یا عدم برابری کے) کسی اور کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ مثال کے طور پر X سے Y کا تناسب اخلاقی طور پر بہتر ہے اگر متغیرات کی قدریں برابر ہیں اور اخلاقی طور پر کمتر ہے اگر نہیں، یعنی "1:1" کا تناسب "1:2" سے بہتر ہے (اور حتمی طور پر "1:10" سے بہتر ہے)۔ اس قسم کے موقف کی بظاہر وضاحت کے باوجود، اخلاقی خصوصیات کا سوال اتنا آسانی سے حل نہیں ہوتا۔ قدریں ریاضی کے تناسب کے بیانات سے اخذ نہیں کی جاتیں، جو بذات خود اخلاقی طور پر غیر جانبدار ہیں۔ ایک ریاضیاتی تناسب کی برتری کو دوسرے کے مقابلے میں تسلیم کرنا بالکل بے بنیاد ہے، جیسے کہ فیثاغورس (Pythagoreans) کے عجیب و غریب عمل، جنہوں نے اعداد کی مرد، عورت، دوستانہ، کامل، کمزور وغیرہ کی حیثیت سے درجہ بندی کی۔

ابتدائی عطیات (انڈومنٹ) کی برابری یا تبادلے کے نتائج پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے، یہ زیادہ معقول ہو گا کہ کسی کے ذاتی اخلاقی مقام کی برابری یا عدم برابری اور آپسی تعلقات (بشمول تبادلوں) کے جائزے کی بنیاد کے طور پر توجہ مرکوز کی جائے کہ۔ لہٰذا: کوئی شخص اخلاقی طور پر دوسرے شخص سے برتر (یا کمتر) مقام نہیں رکھتا یا کچھ لوگ اخلاقی طور پر دوسروں سے برتر (یا کمتر) ہیں۔ اس بنیاد پر کوئی ابتدائی انڈومنٹ یا نتائج کی برابری پر اصرار

کرنے کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دونوں نقطہ نظر زبردستی کی دوبارہ تقسیم پر اتفاق کر سکتے ہیں، چاہے وہ عدم برابری کو ختم کرنے یا قائم کرنے کے لئے ہو۔ اور دونوں صورتوں میں مرکزی دلیل فریقین کی اخلاقی حیثیت ہو گی، اس کے باوجود کہ اخلاقی حیثیت کے خیال اور ان حقیقی حالات کے درمیان ایک ناقابلِ تسخیر تصوری فرق ہے جن سے لوگ معاملہ کرتے ہیں۔

اس طرح ایک طرف وضع کردہ مرکزی سوال انسانی اخلاقی حیثیت کے درمیان تعلق کے بارے میں ہو گا تو دوسری طرف وہ اس مال، معیار، یا قدر جس تک کسی شخص کی رسائی ہے کے بارے میں ہو گا۔ تو ہم آگے بڑھ کر یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیوں دو اخلاقی طور پر برابر افراد کو صرف صبح کے وقت ایک ہی مقدار، معیار، یا قیمت کی کافی پینی چاہیے؟ یا کیا ایک خیرات دینے والا شخص اور اس کا کنجوس پڑوسی، دونوں برابر اخلاقی حیثیت کے حامل ہیں (یا کیا وہ ہیں؟) اور ان کو برابر پھلنے والے باغات کے مالک ہونا چاہیے جو برابر قیمتی فصلیں پیدا کرتے ہیں؟ برابر اخلاقی حیثیت کا عطیات، کھپت یا ملکیت کی برابری کے ساتھ کوئی واضح تعلق نظر نہیں آتا ہے۔ دو شطرنج کے کھلاڑیوں کے تعلق پر غور کریں، دونوں اخلاقی طور پر برابر اہمیت کے حامل ہیں۔ کیا ان کی برابر اخلاقی اہمیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مہارتیں بھی برابر ہونی چاہیے یا ہر کھیل کو ڈرا میں ختم ہونا چاہیے؟ یا کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں ایک ہی قواعد کے مطابق کھیلنا چاہیے، جو یہ حقیقت بتائے گی کہ ان کا کھیل ڈرا میں ختم ہونے کی کوئی اخلاقی تجویز نہیں رکھتے؟ برابر اخلاقی حیثیت اور ابتدائی عطیات (انڈومنٹ) یا خاص نتائج کے درمیان کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ اگر ہم عطیات یا نتائج کی بجائے رویئوں اور قواعد پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ حالات کا فیصلہ انسانی رویئوں، انکے

انتخاب اور (خاص طور پر جرائم کے معاملات میں) نیتوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کی جیب میں کتنی رقم ہے اور کیا یہ رقم اس کے پڑوسی کی جیب میں موجود رقم سے زیادہ ہے یا کم، یہ خود انسانی زندگی میں اخلاقی طور پر اہم عنصر نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ یہ وہاں کیسے پہنچی۔ ایک رئیس اور ایک ٹیکسی ڈرائیور دونوں کو انصاف یا ناانصافی کے طور پر جانچا جا سکتا ہے، اس بات پر انحصار کرتے ہوئے کہ ان کے اعمال عالمی اخلاقی معیار کے مطابق ہیں یا نہیں، جیسے کہ وہ انصاف کے اصولوں اور اپنے اور دوسروں میں موجود اخلاقی ایجنسی کا احترام کرتے ہیں یا نہیں۔ تعریف اور الزام تراشی، غربت کی بنیاد پر نہیں بلکہ لوگوں کے اعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ مختلف عہدے اچھے اور برے اعمال، فضیلت اور بدی، انصاف اور ناانصافی کے لیے مختلف مواقع پیش کرتے ہیں لیکن یہ معیارات عطیات یا نتائج کو نہیں بلکہ انسانی رویئے کو کنٹرول کرتے ہیں۔ معیارات کا مساوی اطلاق اخلاقی طور پر مساوی حیثیت کا اخلاقی احساس ہے، جس کی بنیاد پر ہم اخلاقی طور پر سلوک کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اخلاقی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ جرم ایک جرم ہے، چاہے وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے کیا ہو یا ایک رئیس نے اور ایک منافع بخش ایماندار تجارت ایک منافع بخش ایماندار تجارت ہے، چاہے وہ دو ٹیکسی ڈرائیوروں کے درمیان ہو، دو رئیسوں کے درمیان اور یا ایک رئیس اور ایک ٹیکسی ڈرائیور کے درمیان ہو۔

آیئے دولت اور مساوات کے تعلقات پر غور کرنے کی طرف لوٹتے ہیں۔ دولت کا حصول یا تو منصفانہ رویے کا نتیجہ ہو سکتا ہے یا زبردستی کا۔ آزاد منڈی کے تبادلے زیادہ عدم مساوات یا زیادہ مساوات کا باعث بن سکتے ہیں، اور ریاستی مداخلت اور دوبارہ تقسیم بھی زیادہ عدم مساوات یا زیادہ مساوات کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ کسی بھی قسم کی بات چیت میں کوئی اندرونی

مساوات یا عدم مساوات نہیں ہوتی۔ ایک کاروباری شخص دولت پیدا کر سکتا ہے اور اس طرح دوسرے شخص سے زیادہ حاصل کر سکتا ہے، یہاں تک کہ اگر دولت کی تخلیق دوسرے شخص کو بھی فائدہ پہنچائے۔ آزاد منڈیوں میں تبادلے وسیع پیمانے پر خوشحالی پیدا کر کے اور طاقتور لوگوں کے ناانصافی کے وراثتی استحقاق کو ختم کر کے بھی زیادہ مساوات کا سبب بن سکتے ہیں۔ ایک ڈاکو کسی سے چوری کر سکتا ہے اور پھر متاثرہ شخص سے زیادہ یا برابر ہو سکتا ہے، جس سے زیادہ عدم مساوات یا زیادہ مساوات پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح، ریاست کی منظم زبردستی کی طاقت کی مداخلت سے یا تو مارکیٹ کے شرکاء کے کیے گئے انتخاب کو زیر کر کے (تحفظ پسندی، سبسڈی اور "رینٹ سیونگ" کے ذریعے) یا محض وحشیانہ طاقت اور تشدد کے استعمال کے ذریعے سے بھی دولت کی زبردست عدم مساوات پیدا ہو سکتی ہے، جیسا کہ یقیناً کمیونسٹ حکمرانی والے ممالک میں ہوا۔ (برابری کے لیے رسمی طور پر پرعزم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حقیقت میں مساوات پیدا کی جائے، جیسا کہ دہائیوں کے تلخ تجربات نے دکھایا۔)

آیا کوئی قانونی اور اقتصادی نظام آمدنی کی برابری کے لیے زیادہ سے زیادہ یا کم اندازے پیدا کرتا ہے، یہ ایک تصوراتی نہیں بلکہ عملی مسئلہ ہے۔ دی اکنامک فریڈم آف دی ورلڈ رپورٹ (www.freetheworld.com) اقتصادی آزادی کے درجوں کی پیمائش کرتی ہے اور پھر ان انڈیکسز کا موازنہ اقتصادی خوشحالی کے مختلف اشاروں (طول عمری، خواندگی، بدعنوانی کی سطح، فی کس آمدنی وغیرہ) سے کرتی ہے۔ اعداد و شمار نہ صرف یہ دکھاتے ہیں کہ سب سے زیادہ آزاد معیشتوں والے ممالک کے باشندے کم اقتصادی آزادی والے ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ امیر ہیں، بلکہ یہ بھی کہ آمدنی کی عدم مساوات (خاص طور پر، آبادی کے

غریب ترین 10 فیصد کی طرف سے کمائی جانے والی قومی آمدنی کا حصہ) مختلف پالیسیوں کی خصوصیت نہیں جبکہ ان کی آمدنی کی مقدار ہے۔

دنیا کے ممالک کو چار چوتھائی حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے (ہر ایک میں دنیا کے ممالک کا 25فیصد)، 2008 میں (جس سال کے لیے تازہ ترین اعداد و شمار دستیاب ہیں) کم سے کم آزادی والے ممالک میں آبادی کے غریب ترین 10 فیصد کی طرف جانے والی قومی آمدنی کا اوسط حصہ (جس میں زمبابوے، میانمار، اور شام جیسے ممالک شامل ہیں) 2.47 فیصد تھی؛ اگلے (تیسرے کم سے کم آزاد) چوتھائی میں، 2.19 فیصد؛ اگلے (دوسرے کم سے کم آزاد) چوتھائی میں، 2.27 فیصد اور سب سے زیادہ آزاد چوتھائی میں 2.58 فیصد۔ یہ فرق بمشکل قابل ذکر ہے۔ یعنی ایسی عدم مساوات کو اقتصادی پالیسیوں کے اصولوں سے متاثر ہونے سے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف غریب ترین 10 فیصد کی آمدنی کی مقدار میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے، بالکل اس لیے کہ یہ متغیر (غیر محکم) یقینی طور پر اقتصادی پالیسیوں سے محفوظ نہیں ہے۔ کم سے کم آزاد ممالک میں غریب ترین 10 فیصد میں شامل ہونے کا مطلب سالانہ اوسط آمدنی 910 ڈالر ہے جبکہ سب سے زیادہ آزاد منڈی کی معیشتوں میں غریب ترین 10 فیصد میں شامل ہونے کا مطلب سالانہ اوسط آمدنی 8,474 ڈالر ہے۔ جو لوگ غریب ہیں ان کے لیے سوئٹزرلینڈ میں غریب ہونا شام کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔

یہ بذات خود اخلاقی مسئلہ نہیں ہے کہ میرے اور آپکے درمیان ابتدائی وسائل کی برابری ہے یا آزادانہ تبادلوں کے بعد ہماری ملکیت برابر ہے۔ دوسری طرف، اخلاقی طور پر برابر افراد کے ساتھ برابر سلوک نہ کرنا اور ان پر مساوی قواعد لاگو نہ کرنا، جو کہ زیادہ برابر نتائج پیدا

کرنے کی کوشش میں کیا جاتا ہے (جو کہ عام طور پر کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ ایسے نتائج کو آسانی سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا)، یقینی طور پر ایک اخلاقی مسئلہ ہے۔ یہ ایک اخلاقی برابری کی خلاف ورزی ہے جو اہمیت رکھتی ہے۔

دنیا میں دولت کی عدم مساوات کے حوالے سے سب سے بڑا اسکینڈل یہ نہیں ہے کہ معاشی طور پر آزاد معاشروں میں امیر اور غریب کے درمیان برابری نہیں ہے بلکہ یہ کہ معاشی طور پر آزاد معاشروں کے لوگوں اور معاشی طور پر غیر آزاد معاشروں کے لوگوں کے درمیان دولت کا بہت بڑا فرق ہے۔ دولت اور غربت کے درمیان یہ فرق یقیناً ایک ایسا مسئلہ ہے جسے قوانین یعنی اقتصادی پالیسیوں میں تبدیلی کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔ معاشی طور پر غیر آزاد معاشروں کے لوگوں کو آزاد کر دینا بڑی مقدار میں دولت پیدا کرے گا، جو دنیا کے امیروں اور غریبوں کے درمیان فرق کو کم کرنے کے لیے کسی بھی دوسرے پالیسی سے زیادہ مؤثر ہو گا۔

مزید یہ کہ یہ انصاف کے ادراک کے مثبت نتیجے کے طور پر ہو گا، جو ان ممالک میں لوگوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک کو ختم کر کے کیا جائے گا جو دوست پروری، شماریات، ریاستی تسلط، عسکریت پسندی، سوشلسٹ معاشرت، بدعنوانی اور طاقت کے استعمال سے بدانتظام ہیں۔ معاشی آزادی، یعنی انصاف کے برابر معیارات اور سب کے حقوق کا مساوی احترام کرنے کا حق، اخلاقی ہستیوں کے لیے صحیح معیار انصاف ہے۔

ایڈم اسمتھ اور لالچ کا افسانہ

اس مضمون میں مصنف اس غلط فہمی کو دور کرتے ہیں کہ ایڈم سمتھ سادہ لوح تھے اور یہ مانتے تھے کہ صرف 'ذاتی مفاد' پر انحصار کرنے سے خوشحالی پیدا ہو گی۔ جو لوگ سمتھ کا حوالہ اس طرح دیتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اس کے کام سے صرف چند اقتباسات ہی پڑھے ہیں اور اس بات سے بے خبر ہیں کہ سمتھ نے اداروں کے کردار اور ریاستی جابرانہ اداروں کے ذریعے ذاتی مفاد کی ناپسندیدہ اثرات پر کتنا زور دیا تھا۔ قانون کی حکمرانی، جائیداد، معاہدہ، اور تبادلہ ذاتی مفاد کو باہمی فائدے کی طرف لے جاتے ہیں جبکہ قانون شکنی اور جائیداد کی بے حرمتی ذاتی مفاد کو ایک مکمل طور پر مختلف اور انتہائی نقصان دہ رخ دیتی ہے۔

یہ بات اکثر سنی جاتی ہے کہ ایڈم سمتھ کا یقین تھا کہ اگر لوگ صرف خود غرضی سے کام کریں تو دنیا میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، اور یہ کہ 'لالچ دنیا کو چلانے والی قوت ہے۔' سمتھ نے یقیناً اس بات پر یقین نہیں کیا کہ صرف خود غرضانہ محرکات پر انحصار کرنے سے دنیا ایک بہتر جگہ بن جائے گی، اور نہ ہی انہوں نے خود غرضانہ رویے کو فروغ دیا یا اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کی کتاب "The Theory of Moral Sentiments" میں 'غیر جانبدار ناظر' کے کردار پر ان کی تفصیلی بحث ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔ سمتھ خود غرضی کے حامی نہیں تھے، لیکن وہ اس بات سے بھی سادہ لوح نہیں تھے کہ وہ یہ سمجھیں کہ دوسروں کی فلاح کے لیے بے لوث وابستگی (یا اس طرح کی وابستگی کا اظہار) دنیا کو بہتر بنا دے

گی۔ جیسا کہ سٹیون ہومز نے اپنے تصحیح مضمون "The Secret History of Self-Interest" میں ذکر کیا ہے۔ اسمتھ بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ بہت سے 'بے غرض' جذبات جیسے حسد، دشمنی، انتقام، جنونیت اور اسی طرح کی دیگر جذبات کے تباہ کن اثرات ہوتے ہیں۔ ہسپانوی انکوزیشن کے جنونی افراد نے یہ سب کچھ اس امید پر کیا کہ اذیت کے آخری لمحے میں، مرتے ہوئے ملحدین توبہ کر سکتے ہیں اور خدا کی رحمت حاصل کر سکتے ہیں، اسے نجات بخش جواز کا نظریہ کہا جاتا تھا۔ ہومبرٹ ڈی رومنز(Humbert de Romans) نے اپنی ہدایات میں انکوزیشن کو تاکید کی کہ وہ ملحدین پر عائد کیے جانے والے سزاؤں کو جماعت کے سامنے جائز ثابت کریں، کیونکہ "ہم خدا سے درخواست کرتے ہیں، اور ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں، کہ آپ میرے ساتھ مل کر اس سے درخواست کریں، کہ وہ اپنی رحمت کے عطیہ سے ان لوگوں کو جو سزا دی جانی ہے، ان کو یہ سزا تحمل سے برداشت کرنے کے قابل بنائے (انصاف کے تقاضے میں، لیکن افسوس کے ساتھ) کہ یہ ان کی نجات کا سبب بنے۔ اسی وجہ سے ہم ایسی سزا عائد کرتے ہیں"۔ سمتھ کے نقطہ نظر میں، دوسروں کی فلاح کے لیے ایسی بے لوث وابستگی بظاہر خود غرض سوداگروں سے اخلاقی طور پر اعلیٰ نہیں تھی، جو پیاسے اور بھوکے گاہکوں کو شراب اور نمکین مچھلی فروخت کر کے خود کو امیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سمتھ عام طور پر خود غرض رویئوں کے حامی نہیں ہیں کیونکہ آیا ایسے محرکات 'ایک پوشیدہ ہاتھ کے ذریعے' عمومی بھلائی کو فروغ دیتے ہیں یا نہیں، یہ بہت زیادہ اس عمل کے سیاق و سباق اور خاص طور پر ادارہ جاتی ماحول پر منحصر ہوتا ہے۔

کبھی کبھی دوسروں کی پسندیدگی حاصل کرنے کی خود غرضانہ خواہش واقعی ہمیں اخلاقی نقطہ نظر اپنانے کی طرف راغب کر سکتی ہے، کیونکہ یہ ہمیں اس بات پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ہم دوسروں کو کیسے نظر آتے ہیں۔ "دی تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس(The Theory of Moral Sentiments)" میں بیان کردہ چھوٹے پیمانے پر بین الشخصی ماحول میں، اس طرح کی تحریک عمومی فائدے کا باعث بن سکتی ہے، کیونکہ 'خود کو ان جیسے خوشگوار جذبات کا موضوع بننے کی خواہش، اور ان لوگوں کی طرح دلکش اور قابل تعریف بننے کی خواہش جن سے ہم سب سے زیادہ محبت اور تعریف کرتے ہیں' ہمیں 'اپنی ہی کردار اور عمل کے غیر جانبدار ناظر بننے' کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بظاہر حد سے زیادہ خود غرضی جب صحیح ادارہ جاتی ماحول میں ہو، دوسروں کے فائدے کے لیے ہو سکتی ہے، جیسے سمتھ کی کہانی میں ایک غریب آدمی کے بیٹے کی کہانی جس کی خواہش نے اسے بے تحاشا محنت کرنے پر مجبور کیا تاکہ دولت جمع کی جا سکے، صرف یہ جاننے کے لیے کہ سخت محنت کے بعد وہ سڑک کے کنارے دھوپ میں بیٹھے ہوئے ایک سادہ بھکاری سے زیادہ خوش نہیں تھا۔

غریب آدمی کے بیٹے کی خود غرضی کی حد سے زیادہ تعاقب نے باقی انسانیت کو فائدہ پہنچایا اور اسے ایسی دولت پیدا کرنے اور جمع کرنے کی طرف راغب کیا جس نے بہت سے دوسرے لوگوں کے وجود کو ممکن بنایا، کیونکہ "زمین انسانوں کی ان محنتوں کی وجہ سے اپنی قدرتی زرخیزی کو دوبارہ دوگنا کرنے اور زیادہ تعداد میں باشندوں کو پالنے پر مجبور ہوئی۔"

سیاسی معیشت کے وسیع تناظر میں جیسا کہ "این انکوائری انٹو دی نیچر اینڈ کازز آف دی ویلتھ آف نیشنز(An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of

(Nations)" کے بہت سارے اقتباسات میں بیان کیا گیا ہے، خاص طور پر جو ریاستی اداروں کے ساتھ تعامل میں ہے، ذاتی مفاد کا حصول ممکنہ طور پر مثبت نتائج کا حامل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر، تاجروں کے ذاتی مفاد انہیں ریاست کو لابی کرنے پر مجبور کرتے ہیں تاکہ کارٹیلز، تحفظ پسندی، اور یہاں تک کہ جنگ بھی پیدا کی جا سکے: "یقیناً یہ توقع رکھنا کہ برطانیہ میں کبھی بھی تجارت کی آزادی مکمل طور پر بحال ہو جائے گی، اتنا ہی احمقانہ ہے جتنا کہ یہ توقع کرنا کہ وہاں کبھی بھی اوشیانا یا یوٹوپیا (Oceana or Utopia) قائم ہو جائے گا۔ نہ صرف عوام کے تعصبات بلکہ اس سے بھی زیادہ ناقابلِ تسخیر ہے، بہت سے لوگوں کے ذاتی مفادات، اس کی غیر متزلزل مخالفت کرتے ہیں۔" اجارہ داریوں سے تاجروں کے معمولی منافع یا مفادات کو سلطنتوں اور جنگوں کے معاملے میں عوام پر خوفناک بوجھ ڈال کر حاصل کیا جاتا ہے:

> "ہمارے ان قوانین کے نظام میں جو ہماری امریکی اور مغربی ہندوستانی کالونیوں کے انتظام کے لیے قائم کیے گئے ہیں، دیگر تجارتی ضوابط کے مقابلے میں گھریلو صارفین کے مفاد کو پیدا کرنے والوں (پروڈیوسرز) کے مفاد پر قربان کیا گیا ہے۔ ایک عظیم سلطنت قائم کی گئی ہے تاکہ ایک ایسی قوم پیدا کی جا سکے جو ہمارے مختلف پروڈیوسرز کی دکانوں سے ان تمام اشیاء کو خریدنے پر مجبور ہو جو وہ انہیں فراہم کر سکتے ہیں۔ اس اجارہ داری سے ہمارے پروڈیوسرز کو حاصل ہونے والے تھوڑے سے قیمت میں اضافے کی خاطر، گھریلو صارفین کو اس سلطنت کو برقرار رکھنے اور اس کا دفاع کرنے کے پورے اخراجات کا بوجھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ صرف اور صرف اسی مقصد کیلئے پچھلی دو جنگوں میں، دو سو ملین سے زیادہ خرچ کیے

گئے ہیں، اور ایک سو ستر ملین سے زیادہ کا نیا قرض لیا گیا ہے جو کہ سابقہ جنگوں کے لیے اسی مقصد کے لیے خرچ کیے گئے تمام اخراجات کے علاوہ ہے۔ اس قرض کا سود اکیلا ہی اس پوری اضافی منافع سے زیادہ ہے جو کہ کبھی دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کالونی کی تجارت کی اجارہ داری سے حاصل کیا گیا ہے، بلکہ اس تجارت کی کل مالیت سے زیادہ یا ان اشیاء کی مجموعی مالیت سے زیادہ ہے جو اوسطاً سالانہ کالونیوں کو برآمد کی گئی ہیں۔"

سمتھ کے خیالات کے مطابق، اولیور سٹون کی فلم "وال سٹریٹ" کے خیالی کردار گورڈن گیکو کے الفاظ میں، "لالچ اچھی چیز ہے" کے بارے میں ان کا مؤقف " کبھی کبھی ہاں، اور کبھی نہیں" ہے (یہ فرض کرتے ہوئے کہ تمام خود غرضانہ رویہ "لالچ" ہے)۔ فرق ادارجاتی ترتیب میں ہے۔

اس عام نظریئے کے بارے میں کیا خیال ہے کہ بازار خود غرضانہ رویے کو فروغ دیتے ہیں اور یہ کہ تبادلے کے ذریعے پیدا ہونے والے نفسیاتی رویے سے خود غرضی کی ترغیب ملتی ہے؟ مجھے کوئی اچھی وجہ معلوم نہیں ہے کہ مارکیٹیں خود غرضی یا لالچ کو فروغ دیتی ہیں، اس معنی میں کہ مارکیٹ تعامل لوگوں کے لالچ یا خود غرض ہونے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے، جیسا کہ ان معاشروں میں دیکھا جاتا ہے جہاں ریاستیں مارکیٹوں کو دبانے، حوصلہ شکنی کرنے، مداخلت کرنے یا متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ حقیقت میں مارکیٹیں سب سے زیادہ ایثار پسندوں کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ خود غرضوں کو اپنے مقاصد کو امن سے آگے بڑھانے کے قابل بناتی ہیں۔ جو لوگ اپنی زندگی دوسروں کی مدد کے لیے وقف کرتے ہیں،

وہ بھی مارکیٹوں کا استعمال اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے کرتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے وہ لوگ جن کا مقصد اپنی دولت کو بڑھانا ہوتا ہے۔ مؤخر الذکر میں سے کچھ دوسروں کی مدد کرنے کی اپنی صلاحیت کو بڑھانے کے لیے دولت بھی جمع کرتے ہیں۔۔ جارج سوروس اور بل گیٹس اس کی مثالیں ہیں؛ وہ بڑی مقدار میں پیسہ کماتے ہیں، کم از کم جزوی طور پر اس لیے کہ وہ اپنی وسیع فلاحی سرگرمیوں کے ذریعے دوسروں کی مدد کرنے کی اپنی صلاحیت کو بڑھا سکیں۔ منافع کے حصول میں دولت کی تخلیق انہیں سخاوت کا مظاہرہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔

ایک خیراتی یا پرہیزگار شخص اپنے پاس موجود دولت کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کھانا کھلانے، لباس دینے، اور آرام فراہم کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ مارکیٹیں اسے کم قیمتوں پر کمبل، خوراک، اور دوائیں حاصل کرنے کی اجازت دیتی ہیں تاکہ ان لوگوں کی دیکھ بھال کی جا سکے جنہیں اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ مارکیٹیں دولت کی تخلیق کو ممکن بناتی ہیں جو بدقسمت لوگوں کی مدد کے لیے استعمال کی جا سکتی ہیں اور خیرات کرنے والوں کو دوسروں کی مدد کرنے کی اپنی صلاحیت کو زیادہ سے زیادہ کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ مارکیٹیں خیراتی لوگوں کی خیرات کو ممکن بناتی ہیں۔

ایک عام غلطی یہ ہے کہ لوگوں کے مقاصد کو صرف ان کے "ذاتی مفاد" سے جوڑا جاتا ہے، جو پھر "خود غرضی" کے ساتھ الجھا دیا جاتا ہے۔ مارکیٹ میں لوگوں کے مقاصد واقعی خود کے مقاصد ہیں، لیکن خود کے طور پر مقاصد رکھنے والے، ہم دوسروں کے مفادات اور خوشحالی کے بارے میں بھی فکر مند ہیں جیسے ہمارے خاندان کے اراکین، ہمارے دوست، ہمارے

پڑوسی، اور یہاں تک کہ وہ اجنبی جن سے ہم کبھی نہیں ملیں گے۔ حقیقت میں، مارکیٹیں لوگوں کو دوسروں کی بشمول اجنبیوں کے ضروریات پر غور کرنے کے لیے بھی تیار کرتی ہیں۔

فلپ وکسٹیڈ(Philip Wicksteed) نے مارکیٹ تبادلوں میں محرکات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ "خود غرضی" کی اصطلاح استعمال کرنے کی بجائے (مثال کے طور پر کوئی غریبوں کے لیے کھانا خریدنے کے لیے بازار جا سکتا ہے) انہوں نے مارکیٹ تبادلوں میں شامل ہونے کی محرکات کو بیان کرنے کے لیے "نان ٹوئزم" کی اصطلاح وضع کی۔ ہم اپنے دوستوں یا دور دراز اجنبیوں کی مدد کرنے کے لیے، پیسے کمانے کے لیے اپنی مصنوعات بیچ سکتے ہیں، لیکن جب ہم کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ قیمت پر سودا کرتے ہیں، تو ہم شاذ و نادر ہی اس پارٹی کی فلاح و بہبود کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں جس کے ساتھ ہم سودے بازی کر رہے ہیں۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں، تو ہم ایک تبادلہ اور عطیہ کر رہے ہوتے ہیں، جو کہ تبادلے کی نوعیت کو کچھ حد تک پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ جو لوگ جان بوجھ کر زیادہ ادائیگی کرتے ہیں، عموماً اچھے کاروباری لوگ نہیں ہوتے، اور جیسا کہ ایچ بی ایکٹن(H.B. Acton) نے اپنی کتاب (The Morals of the Markets) میں ذکر کیا ہے، نقصان پر کاروبار چلانا عام طور پر ایک بہت بے وقوفانہ اور احمقانہ طریقہ ہے۔

ان لوگوں کے لیے جو صنعت و تجارت میں شمولیت کے بجائے سیاست میں شمولیت کی تعریف کرتے ہیں، یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ سیاست والا بہت زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی بھلائی کرتا ہے۔ والٹئیر، جس نے سمتھ سے پہلے لکھا ہے، نے اس فرق کو واضح طور پر دیکھا ہے۔

اپنی کتاب "Letters Concerning the English Nation" میں "On Trade" کے عنوان سے مضمون میں (والٹئیر نے انگریزی میں لکھا، جس میں وہ کافی روانی رکھتے تھے، اور پھر اس نے فرانسیسی زبان میں دوبارہ لکھا اور اسے Lettres Philosophiques کے نام سے شائع کیا)، انہوں نے نوٹ ذکر کیا ہے کہ:

"فرانس میں، مارکوئس (Marquis) کا خطاب کسی بھی شخص کو مفت دیا جاتا ہے جو اسے قبول کرے؛ اور جو کوئی بھی دور دراز کے صوبوں سے اپنے پرس میں پیسے لے کر اور ایک نام جس کے آخر میں "ac" یا "ille" آتا ہو، پیرس میں آتا ہے تو وہ غرور سے چل سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے، 'میرے جیسا آدمی! میری حیثیت اور شکل کا آدمی!' اور وہ ایک تاجر کو مکمل تحقیر کے ساتھ دیکھ سکتا ہے؛ جبکہ دوسری طرف تاجر اپنے پیشے کے بارے میں ناپسندیدگی سن کر اتنا بے وقوف ہوتا ہے کہ اس پر شرماتا ہے۔ تاہم، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ قوم کے لیے زیادہ مفید کون ہے؛ ایک لارڈ، جو پوری وضع کے ساتھ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے، جو بالکل جانتا ہے کہ بادشاہ کب جاگتا ہے اور کب سوتا ہے؛ اور جو خود عظمت اور شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب وہ ایک وزیر اعظم کی اینٹی چیمبر میں غلامی کی اداکاری کر رہا ہوتا ہے؛ یا ایک تاجر، جو اپنے ملک کو امیر کرتا ہے، اپنے گودام (Compting House) سے سورت اور گرینڈ قاہرہ کو آرڈرز بھیجتا ہے اور دنیا کی خوشی میں حصہ ڈالتا ہے۔"

جب ہمارے دور حاضر کے سیاستدان اور دانشور ان تاجروں اور سرمایہ داروں پر طنزیہ نظر ڈالتے ہیں اور مختلف چیزوں پر تنقید کرتے ہوئے اپنی فوقیت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ان کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسی وقت تاجروں، سرمایہ داروں، مزدوروں، سرمایہ کاروں، کاریگروں، کسانوں، موجدوں، اور دیگر پیداواری پیداکنندگان سے وہ دولت پیدا کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں جسے سیاستدان ہی ضبط کرتے ہیں اور وہ سرمایہ دارانہ مخالف دانشور جو ان سے حقارت کرتے ہیں وہ بھی لالچی انداز میں استعمال کرتے ہیں۔

سیاست کی طرح مارکیٹ اس بات پر منحصر نہیں ہیں کہ لوگ خودغرض ہوں۔ نہ ہی مارکیٹ تبادلے زیادہ خودغرض رویے یا محرکات کو فروغ دیتے ہیں۔ لیکن سیاست کے برعکس، آزاد تبادلہ جو رضاکار شرکاء کے درمیان ہوتا ہے دولت اور امن پیدا کرتا ہے، جو وہ حالات ہیں جن میں سخاوت، دوستی، اور محبت پروان چڑھتی ہیں۔ اس کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت ہے، جیسا کہ ایڈم سمتھ اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔

آئن رینڈ اور سرمایہ داری
اخلاقی انقلاب

اس مضمون میں معروضی فلسفی ڈیوڈ کیلی "چوتھے انقلاب" کی تجویز پیش کرتے ہیں تا کہ جدید دنیا کی بنیادوں کو مکمل کیا جا سکے اور سرمایہ داری کے ذریعے ممکن بنائی جانے والی کامیابیوں کو محفوظ کیا جا سکے۔

ڈیوڈ کیلی دی اٹلس سوسائٹی کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر ہیں، جو مقصدیت (آبجیکٹوزم) کے فلسفہ کی ترقی اور اشاعت کو فروغ دیتی ہے۔ کیلی "The Evidence of the Senses, The Art of Reasoning" (جو کہ امریکہ میں منطق پر سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں سے ایک ہے)، "A Life of One's Own: Individual Rights and the Welfare State"، اور دیگر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے ویسر کالج (Vassar College) اور برینڈیس یونیورسٹی (Brandeis University) میں فلسفہ پڑھایا ہے اور ہارپرز، دی سائنسز، ریزن، ہارورڈ بزنس ریویو، اور بیرنز جیسے مشہور اخبارات اور جریدوں میں وسیع پیمانے پر اپنے مضامین شائع کئے ہیں۔

اس مضمون کو دی نیو انڈویژولسٹ، بہار 2009 (The New Individualist, spring 2009) سے مصنف کی اجازت پر دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔

"دنیا کو دوبارہ شروع کرنا ہمارے اختیار میں ہے۔"

– تھامس پین، "کامن سینس"، 1792

مالیاتی منڈیوں میں بحران نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جذبات کا ایک متوقع سیلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ حکومتی ضوابط اس بحران کا ایک بڑا سبب تھے، سرمایہ دارانہ مخالفین اور میڈیا میں ان کے حمایتیوں نے بازار کو مورد الزام ٹھہرایا اور نئے پابندیوں کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے پہلے ہی مالیاتی منڈیوں میں بے مثال مداخلت کی ہے اور اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ نئے اقتصادی کنٹرول وال اسٹریٹ سے کہیں آگے تک بڑھ جائیں گے۔

پیداوار اور تجارت کا ضابطہ ہمارے مخلوط معیشت کے نظام میں حکومت کے دو بنیادی کاموں میں سے ایک ہے۔ دوسرا ہے دوبارہ تقسیم — آمدنی اور دولت کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنا۔ اس میدان میں بھی سرمایہ دارانہ مخالفین نے نئے حقوق جیسے کہ صحت کی ضمانت کے ساتھ ساتھ امیروں پر نئے ٹیکس کے بوجھ کا مطالبہ کرنے کے لیے موقع کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اقتصادی بحران اور باراک اوباما کے انتخاب نے دوبارہ تقسیم کے لیے ایک بڑی دبی ہوئی مانگ کو ظاہر کیا ہے۔ یہ مانگ کہاں سے آتی ہے؟ اس سوال کا بنیادی جواب دینے کے لیے، ہمیں سرمایہ داری کے آغاز اور دوبارہ تقسیم کے دلائل پر غور کرنا ہوگا۔

سرمایہ دارانہ نظام 1750 سے 1850 کے دوران تین انقلابات کے نتیجے میں پروان چڑھا۔ پہلا ایک سیاسی انقلاب تھا: لبرلزم کی فتح، خاص طور پر قدرتی حقوق کے نظریے کا غلبہ اور یہ نظریہ کہ حکومت کا کام فردی حقوق، بشمول ملکیت کے حقوق کے تحفظ تک محدود ہونا چاہیے۔ دوسرا انقلاب اقتصادی فہم کی پیدائش تھا، جس کی مثال ایڈم سمتھ کی کتاب "ویلتھ آف نیشنز" نے پیش کی۔ سمتھ نے یہ ظاہر کیا کہ جب افراد کو اپنی اقتصادی مفادات کے

تعاقب میں آزادی دی جاتی ہے، تو نتیجہ انتشار نہیں بلکہ ایک خود بخود نظام ہے، ایک مارکیٹ کا نظام جس میں افراد کے اعمال ہم آہنگ ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ دولت پیدا ہوتی ہے جو حکومت کے زیر انتظام معیشت کے تحت پیدا ہو سکتی تھی۔ تیسرا انقلاب صنعتی انقلاب تھا۔ تکنیکی جدتوں نے انسان کی پیداوار کی صلاحیتوں کو بڑے پیمانے پر بڑھانے کے ذرائع فراہم کئے۔ اس کا اثر نہ صرف سب کے لئے معیار زندگی بلند کرنے کا تھا بلکہ چوکس اور کاروباری فرد کو ایک ایسی دولت کمانے کا موقع فراہم کرنے کا تھا جو پہلے وقتوں میں ناقابل تصور تھا۔

سیاسی انقلاب، فردی حقوق کے نظریئے کی فتح، اخلاقی اعلی نظری کے جذبے کے ساتھ تھی۔ یہ انسان کو ظلم سے آزادی دلانے اور اس حقیقت کا اعتراف کرنے کی تحریک تھی کہ ہر فرد، چاہے اس کا معاشرتی مقام کچھ بھی ہو، اپنی ذات میں ایک مقصد ہے۔ تاہم اقتصادی انقلاب کو اخلاقی طور پر مبہم انداز میں پیش کیا گیا؛ ایک اقتصادی نظام کے طور پر سرمایہ داری کو گناہ کے طور پر تصور کیا گیا۔ دولت کے خواہش پر خود غرضی اور لالچ کے خلاف مسیحی تعلیمات کی روشنی میں تنقید کی جاتی تھی۔ خود بخود نظام کے ابتدائی طالب علم اس اخلاقی تضاد سے آگاہ تھے—تضاد، جیسا کہ برنارڈ مینڈیول(Bernard Mandeville) نے کہا تھا کہ نجی برائیاں عوامی فوائد پیدا کر سکتی ہیں۔

مارکیٹ کے ناقدین ہمیشہ اس کے اخلاقی پہلو کے بارے میں شبہات کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ سوشلسٹ تحریک اس الزام پر قائم رہی کہ سرمایہ داری خود غرضی، استحصال، بیگانگی، اور ناانصافی کو جنم دیتی ہے۔ نرم صورتوں میں یہی عقیدہ فلاحی ریاست کو پیدا کرتا ہے، جو "سماجی انصاف" کے نام پر حکومتی پروگراموں کے تحت آمدنی کی

تقسیم نو کرتی ہے۔ سرمایہ داری کبھی بھی اس اخلاقی ابہام سے بچ نہیں سکی جس میں اسے تصور کیا گیا تھا۔ اسے اس خوشحالی کی وجہ سے قدر دی جاتی ہے جو یہ لاتی ہے؛ اسے سیاسی اور فکری آزادی کے لیے ایک ضروری پیشگی شرط کے طور پر قدر دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے محافظوں میں سے بہت کم لوگ یہ دعویٰ کرنے کے لیے تیار ہیں کہ سرمایہ داری کے مرکزی طرزِ زندگی -یعنی پیداوار اور تجارت کے ذریعے ذاتی مفاد کی تلاش- اخلاقی طور پر شرافت یا مثالی ہونے کی بجائے معزز ہے۔

مارکیٹ کے خلاف اخلاقی مخالفت کہاں سے آتی ہے، اس میں کوئی راز نہیں۔ یہ ایثار کی اخلاقیات سے پیدا ہوتی ہے، جو مغربی ثقافت میں گہری جڑیں رکھتی ہے، جیسا کہ درحقیقت زیادہ تر ثقافتوں میں ہے۔ ایثار کے معیار کے مطابق، ذاتی مفاد کی تلاش بہترین صورت میں ایک غیر جانبدار عمل ہے، جو اخلاقیات کی حدود سے باہر ہے، اور بدترین صورت میں یہ گناہ ہے۔ بازار میں کامیابی یقیناً رضاکارانہ تجارت اور اس طرح دوسروں کی ضروریات کو پورا کرنے کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جو لوگ کامیاب ہوتے ہیں وہ ذاتی فائدے سے متاثر ہوتے ہیں، اور اخلاقیات کا تعلق اتنا ہی مقاصد سے ہے جتنا کہ نتائج سے ہوتا ہے۔

روزمرہ کی گفتگو میں "ایثار" کی اصطلاح کو اکثر صرف مہربانی یا عام شائستگی کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا حقیقی معنی، تاریخی اور فلسفیانہ لحاظ سے خود کی قربانی ہے۔ سوشلسٹوں کے لیے جنہوں نے یہ اصطلاح ایجاد کی، اس کا مطلب تھا خود کو ایک بڑے سماجی مجموعے میں مکمل طور پر غرق کر دینا۔ جیسا کہ آئن رینڈ نے کہا، "ایثار کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کا

حق نہیں ہے کہ وہ اپنے وجود کے لیے خود کو استعمال کرے، دوسروں کی خدمت اس کے وجود کا واحد جواز ہے، اور خود کی قربانی اس کا اعلیٰ اخلاقی فرض، فضیلت، اور قدر ہے۔" اس سخت معنوں میں ایثار "سماجی انصاف" کے مختلف تصورات کی بنیاد ہے جو دولت کی تقسیم نو کے لیے حکومتی پروگراموں کے دفاع میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام ان لوگوں کی لازمی قربانی کی نمائندگی کرتے ہیں جو ان کی حمایت کے لیے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ یہ افراد کو اجتماعی وسائل کے طور پر استعمال کرنے کی نمائندگی کرتے ہیں تاکہ انہیں دوسروں کے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے۔ اور یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی بناء پر کسی بھی شخص کو جو سرمایہ داری کا دفاع کرتا ہے، اخلاقی طور پر اسکی مخالفت کرنی چاہیئے۔

سماجی انصاف کی ضرورت(Demands for Social Justice)

سماجی انصاف کی ضرورت دو مختلف شکلوں میں سامنے آتی ہے، جنہیں میں ویلفیئریزم (فلاحیت / فلاح و بہبود) اور مساوات پسندی کہوں گا۔ ویلفیئریزم کے مطابق افراد کو زندگی کی کچھ بنیادی ضروریات حاصل کرنے کا حق ہے، جس میں کم از کم خوراک، رہائش، کپڑے، طبی نگہداشت، تعلیم وغیرہ شامل ہیں۔ معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ یقینی بنائے کہ تمام اراکین کو یہ ضروریات حاصل ہوں۔ تاہم ایک آزاد سرمایہ دارانہ نظام یہ ضروریات سب کو فراہم نہیں کرتا۔ لہذا، ویلفیئریزم کے حامی دلیل دیتے ہیں کہ سرمایہ داری اپنی اخلاقی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام ہے اور اس لیے اسے ریاستی عمل کے ذریعے تبدیل کرنا چاہیئے تاکہ ان لوگوں کو یہ چیزیں فراہم کی جاسکیں جو اپنی کوششوں سے انہیں حاصل نہیں کر سکتے۔

مساوات پسندی کے مطابق معاشرے کی پیدا کردہ دولت کو منصفانہ طور پر تقسیم کرنا چاہیئے۔ یہ غیر منصفانہ ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کے مقابلے میں پندرہ، پچاس، یا سو گنا زیادہ آمدنی کمائیں۔ لیکن آزاد سرمایہ داری ان آمدنی اور دولت کے فرق کی اجازت دیتی ہے اور اسے فروغ دیتی ہے، اس لیے یہ غیر منصفانہ ہے۔ مساوات پسندی کی خصوصیت آمدنی کی تقسیم پر مبنی شماریات کا استعمال ہے۔ مثال کے طور پر، 2007 میں امریکہ کے آمدنی کے پیمانے پر سب سے اوپر 20 فیصد گھرانوں نے کل آمدنی کا 50 فیصد کمایا جبکہ سب سے نیچے 20 فیصد نے صرف 3.4 فیصد کمائی کی۔ مساوات پسندی کا مقصد اس فرق کو کم کرنا ہے؛ زیادہ برابری کی سمت میں کوئی بھی تبدیلی انصاف میں اضافہ سمجھی جاتی ہے۔

ان دونوں سماجی انصاف کے تصورات میں فرق یہ ہے کہ فلاح و بہبود کی مطلق اور نسبت کی سطحات میں فرق ہے۔ ویلفیئریزم یہ مطالبہ کرتی ہے کہ لوگوں کو ایک مخصوص کم از کم معیارِ زندگی تک رسائی حاصل ہو۔ جب تک یہ بنیادی "محفوظ جال" موجود ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی کے پاس کتنی دولت ہے یا امیر اور غریب کے درمیان کتنے بڑے فرق ہیں۔ اس لیے ویلفیئریزم کے حامی بنیادی طور پر ان پروگراموں میں دلچسپی رکھتے ہیں جو ان لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں جو ایک مخصوص غربت کی سطح سے نیچے ہیں یا جو بیمار، بے روزگار، یا کسی اور طریقے سے محروم ہیں۔ دوسری طرف، مساوات پسند لوگ فلاح و بہبود کی پرواہ کرتے ہیں۔ مساوات پسند اکثر کہتے ہیں کہ دو معاشروں میں سے، وہ اس معاشرے کو ترجیح دیتے ہیں جس میں دولت زیادہ یکساں طور پر تقسیم ہو، چاہے اس کا مجموعی معیار زندگی کم ہو۔ اس طرح، مساوات پسند حکومت کے اقدامات جیسے ترقی پسند ٹیکس کے نفاذ کی حمایت کرتے ہیں، جس کا مقصد دولت کو پوری آمدنی کے پیمانے پر دوبارہ تقسیم کرنا ہے، نہ کہ صرف نیچے کے

حصے میں۔ وہ تعلیم اور طبی سہولیات جیسے اشیاء کی قومی ملکیت کی بھی حمایت کرتے ہیں، انہیں مکمل طور پر مارکیٹ سے ہٹا کر ہر ایک کو تقریباً مساوی طور پر دستیاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آیئے ان دونوں سماجی انصاف کے تصورات پر باری باری غور کرتے ہیں۔

ویلفیئریزم: غیر اختیاری ذمہ داری

ویلفیئریزم (فلاح و بہبود) کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ لوگوں کو کھانا، رہائش، اور طبی نگہداشت جیسی چیزوں پر حق حاصل ہے۔ وہ ان چیزوں کے مستحق ہیں۔ اس مفروضے کے تحت جو شخص حکومتی پروگرام سے فوائد حاصل کرتا ہے، وہ صرف وہی حاصل کر رہا ہے جو اس کا حق ہے، جیسے کہ ایک خریدار جو اس چیز کو وصول کرتا ہے جس کے لیے اس نے ادائیگی کی ہے، وہ صرف اپنے حق کو حاصل کر رہا ہے۔ جب ریاست ویلفیئر فوائد فراہم کرتی ہے، تو وہ صرف حقوق کی حفاظت کر رہی ہوتی ہے، جیسے کہ جب وہ خریدار کو دھوکہ دہی سے بچاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں شکر گزاری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ویلفیئر حقوق یا مثبت حقوق کا تصور اکثر زندگی، آزادی، اور ملکیت کے روایتی لبرل حقوق پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن ان میں ایک معروف فرق ہے۔ روایتی حقوق دوسروں کی مداخلت کے بغیر کام کرنے کے حقوق ہیں۔ زندگی کا حق اپنے آپ کو بچانے کے لیے عمل کرنے کا حق ہے۔ یہ قدرتی وجوہات سے مرنے سے محفوظ رہنے کا حق نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر وہ موت وقت سے پہلے ہو۔ ملکیت کا حق آزادانہ خرید و فروخت اور فطرت سے غیر ملکیتی اشیاء کو

اپنا بنانے کا حق ہے۔ یہ ملکیت حاصل کرنے کا حق ہے، لیکن فطرت یا ریاست سے جہیز حاصل کرنے کا حق نہیں ہے؛ یہ اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ کوئی کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گا۔ لہذا، یہ حقوق دوسروں پر صرف یہ منفی ذمہ داری عائد کرتے ہیں کہ وہ مداخلت نہ کریں اور کسی کو اس کے انتخاب کے مطابق عمل کرنے سے زبردستی نہ روکیں۔ اگر میں اپنے آپ کو معاشرے سے الگ تصور کروں - مثال کے طور پر کسی صحرائی جزیرے پر رہنے والے، تو میرے حقوق مکمل طور پر محفوظ ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میں زیادہ دن نہ جیوں، اور یقینی طور پر اچھی زندگی نہ گزار سکوں، لیکن میں قتل، چوری، اور حملے سے مکمل آزادی کے ساتھ جیوں گا۔

اس کے برعکس ویلفیئر (فلاحی) حقوق کو کچھ مخصوص اشیاء کے حصول اور ان سے لطف اندوز ہونے کے حقوق کے طور پر سمجھا جاتا ہے، چاہے کسی کے اعمال کچھ بھی ہوں؛ یہ وہ حقوق ہیں کہ اگر کوئی شخص خود ان کو حاصل نہیں کر سکتا تو دوسرے لوگ انہیں فراہم کریں۔ لہذا، ویلفیئر حقوق دوسروں پر مثبت ذمہ داریاں عائد کرتے ہیں۔ اگر میرا کھانے کا حق ہے، تو کسی پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسے اگائے۔ اگر میں اس کی ادائیگی نہیں کر سکتا تو کسی پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ میرے لیے اسے خریدے۔ ویلفیئر کے حامی کبھی کبھی یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ ذمہ داری معاشرے پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے، نہ کہ کسی مخصوص فرد پر۔ لیکن معاشرہ کوئی وجود (ہستی) نہیں ہے اور نہ ہی یہ اپنے افراد کے علاوہ کوئی اخلاقی عامل ہے، لہذا ایسی کوئی بھی ذمہ داری ہم پر بحیثیت افراد عائد ہوتی ہے۔ جہاں تک ویلفیئر حقوق حکومتی پروگراموں کے ذریعے نافذ کیے جاتے ہیں، مثال کے طور پر یہ ذمہ داری تمام ٹیکس دہندگان پر تقسیم کی جاتی ہے۔

اخلاقی نقطہ نظر سے، پھر ویلفیئر زم کا جوہر یہ مفروضہ ہے کہ ایک فرد کی ضرورت دوسرے افراد پر ایک دعویٰ ہے۔ یہ دعویٰ صرف شہر یا قوم تک محدود ہو سکتا ہے، اس میں تمام انسانیت کو شامل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس نظریئے کے تمام ورژنز میں، یہ دعویٰ آپ کے دعویدار کے ساتھ ذاتی تعلق، آپ کے مدد کرنے کے انتخاب یا آپ کے اس کے مدد کے لائق ہونے کے اندازے پر منحصر نہیں ہوتا۔ یہ اس کی ضرورت کے محض حقیقت سے پیدا ہونے والی ایک غیر اختیاری ذمہ داری ہے۔

لیکن ہمیں تجزیہ کو ایک قدم آگے بڑھانا چاہیئے، اگر میں کسی صحرائی جزیرے پر اکیلا رہ رہا ہوں، تو ظاہر ہے کہ میرے پاس کوئی ویلفیئر حقوق نہیں ہیں، کیونکہ وہاں کوئی اور موجود نہیں ہے جو اشیاء فراہم کر سکے۔ اسی وجہ سے، اگر میں ایک ابتدائی معاشرے میں رہتا ہوں جہاں طب کا علم نہیں ہے، تو مجھے طبی نگہداشت کا کوئی حق نہیں ہے۔ ویلفیئر حقوق کا مواد ایک مخصوص معاشرے میں اقتصادی دولت اور پیداواری صلاحیت کی سطح کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسروں کی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری افراد کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ مجھے بطور فرد اس بات پر ملامت نہیں کیا جاسکتا کہ میں دوسروں کو وہ چیز فراہم نہیں کر سکتا جو میں خود پیدا نہیں کر سکتا۔

فرض کریں کہ میں اسے پیدا کر سکتا ہوں اور محض انتخاب کرتا ہوں کہ نہ کروں؟ فرض کریں کہ میں اس سے کہیں زیادہ آمدنی کمانے کی صلاحیت رکھتا ہوں جتنی کہ میں کمارہا ہوں، جس پر لگنے والے ٹیکس سے کسی ایسے شخص کی مدد ہو سکتی ہے جو بصورت دیگر بھوکا رہے گا۔ کیامیں اس شخص کی خاطر زیادہ محنت کرنے، زیادہ کمانے کا پابند ہوں؟ میں کسی بھی ویلفیئر کے

حامی فلسفی کو نہیں جانتا جو یہ کہے کہ میں ہوں۔ مجھ پر دوسروں کی ضرورت کے ذریعے عائد کردہ اخلاقی دعویٰ میری صلاحیت کے علاوہ میرے پیدا کرنے کے ارادے پر بھی منحصر ہے۔

اور یہ ہمیں ویلفیئرزم کے اخلاقی جواز کے بارے میں کچھ اہم بات بتاتا ہے۔ یہ انسانی ضروریات کی تسکین کے حصول کی ذمہ داری پر زور نہیں دیتا، ایسا کرنے میں کامیاب ہونے کا موقع بہت کم ہے۔ بلکہ یہ ذمہ داری مشروط ہے: جو لوگ دولت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، وہ ایسا صرف اس شرط پر کرسکتے ہیں کہ دوسروں کو اس دولت میں حصہ لینے دیا جائے۔ مقصد ضرورت مندوں کو فائدہ پہنچانا نہیں ہے بلکہ قابل افراد کو پابند کرنا ہے۔ اس میں پوشیدہ مفروضہ یہ ہے کہ ایک شخص کی صلاحیت اور پہلا قدم سماجی اثاثے ہیں، جنہیں استعمال کرنے کی اجازت صرف اس شرط پر دی جاسکتی ہے کہ ان کا مقصد دوسروں کی خدمت کرنا ہو۔

مساوات پسندی: "منصفانہ" تقسیم

اگر ہم مساوات پسندی کی طرف جائیں تو ہمیں مختلف منطقی راستے سے جاتے ہوئے وہی اصول ملتے ہیں۔ مساوات پسند کے اخلاقی ڈھانچے کی تعریف انصاف کے تصور سے کی جاتی ہے نہ کہ حقوق سے۔ اگر ہم پورے معاشرے کو دیکھیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ آمدنی، دولت، اور طاقت افراد اور گروہوں کے درمیان ایک خاص طریقے سے تقسیم کی گئی ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے: کیا موجودہ تقسیم منصفانہ ہے؟ اگر نہیں، تو پھر اسے حکومتی پروگراموں کے ذریعے ازسرنو تقسیم کرکے درست کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے ایک خالص مارکیٹ معیشت افراد میں مساوات پیدا نہیں کرتی۔ لیکن بہت کم مساوات پسندوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سخت

نتائج کی مساوات انصاف کا تقاضا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ برابری کے نتائج کی حمایت کی جاتی ہے اور کسی بھی مساوات سے انحراف کو معاشرے کی مجموعی بھلائی کے فوائد سے جائز قرار دیا جانا چاہیے۔ اس طرح انگریزی مصنف R. H. Tawney نے لکھا ہے کہ؛ "حالات کی عدم مساوات کو اس حد تک معقول سمجھا جاتا ہے جتنا کہ وہ ان خدمات کے حصول کے لیے ضروری شرط ہے جن کی کمیونٹی کو ضرورت ہے۔" جان رالز (John Rawls) کے مشہور "فرق کے اصول (Difference Principle)" کے مطابق، معاشرے میں سب سے کمزور لوگوں کے مفادات کے لیے عدم مساوات کی اجازت ہے، یہ نقطہ نظر کی حالیہ ترین مثال ہے۔ دوسرے الفاظ میں، مساوات پسند تسلیم کرتے ہیں کہ سخت مساوات پیداوار پر تباہ کن اثر ڈالے گی۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر کوئی معاشرے کی دولت میں یکساں طور پر حصہ نہیں ڈالتا۔ لہذا، لوگوں کو ان کی پیداواری صلاحیت کے مطابق کسی حد تک انعام دینا ضروری ہے، تاکہ انہیں اپنی بہترین کوششیں کرنے کی ترغیب ملے۔ لیکن ایسی کوئی بھی تفاوت عوامی بھلائی کے لیے ضروری ہونے تک محدود ہونی چاہیئے۔

اس اصول کی فلسفیانہ بنیاد کیا ہے؟ مساوات پسند اکثر دلیل دیتے ہیں کہ یہ انصاف کے بنیادی اصول سے منطقی طور پر اخذ ہوتا ہے: کہ لوگوں کے ساتھ مختلف سلوک صرف اس صورت میں کیا جائے جب وہ کسی اخلاقی لحاظ سے مختلف ہوں۔ اگر ہم اس بنیادی اصول کو آمدنی کی تقسیم پر لاگو کرنے جا رہے ہیں، تاہم، ہمیں پہلے یہ فرض کرنا ہوگا کہ معاشرہ واقعی آمدنی کی تقسیم کے عمل میں مصروف ہے۔ یہ مفروضہ واضح طور پر غلط ہے۔ ایک مارکیٹ معیشت میں آمدنی کا تعین لاکھوں افراد کے انتخاب سے ہوتا ہے—صارفین، سرمایہ کار، کاروباری افراد، اور مزدور۔ یہ انتخاب سپلائی اور طلب کے قوانین سے مربوط ہیں، اور یہ کوئی اتفاق

نہیں ہے کہ ایک کامیاب کاروباری، مثال کے طور پر، ایک دن کے مزدور سے کہیں زیادہ کماتا ہے۔ لیکن یہ معاشرے کی طرف سے کسی شعوری ارادے کا نتیجہ نہیں ہے۔ 2007 میں، امریکہ میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی تفریحی شخصیت اوپرا ونفری (Oprah Winfrey) تھیں، جس نے تقریباً 260 ملین ڈالرز کمائے۔ یہ اس لیے نہیں تھا کہ "معاشرے" نے فیصلہ کیا کہ وہ اتنی زیادہ قیمت کی مستحق ہیں بلکہ اس لیے کہ لاکھوں شائقین نے فیصلہ کیا کہ ان کا شو دیکھنے کے لائق ہے۔ یہاں تک کہ ایک سوشلسٹ معیشت میں بھی، جیسا کہ ہم اب جانتے ہیں، اقتصادی نتائج حکومتی منصوبہ سازوں کے کنٹرول میں نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ بدعنوانی کے باوجود یہ ایک بے ساختہ ترتیب ہے، جس میں نتائج بیوروکریٹک جھگڑوں، بلیک مارکیٹس، اور اس طرح کی چیزوں سے طے ہوتے ہیں۔

کسی حقیقی تقسیم کے عمل کی عدم موجودگی کے باوجود، مساوات پسند اکثر دلیل دیتے ہیں کہ معاشرہ اس بات کو یقینی بنانے کا ذمہ دار ہے کہ آمدنی کی شماریاتی تقسیم منصفانہ ہونے کے کچھ معیار پر پورا اترے۔ کیوں؟ کیونکہ دولت کی پیداوار ایک تعاون پر مبنی سماجی عمل ہے۔ بہ نسبت خود کفیل پیداکنندگان کے معاشرے کے، تجارت اور محنت کی تقسیم کار کے حامل معاشرے میں زیادہ دولت پیدا ہوتی ہے۔ تقسیم کار کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگ حتمی پیداوار میں حصہ ڈالتے ہیں اور تجارت کا مطلب ہے کہ ایک اور وسیع دائرہ کے لوگ اس دولت کے حصول کے ذمہ دار ہیں جو پیداکنندگان کو حاصل ہوتی ہے۔ مساوات پسند کہتے ہیں کہ پیداوار ان تعلقات سے اتنے تبدیل ہو گئے ہیں کہ پورے گروہ کو پیداوار کی اصل اکائی اور دولت کے اصل منبع کے طور پر سمجھا جانا چاہیے۔ کم از کم یہ اس دولت کے فرق کا ذریعہ ہے جو ایک تعاون پر مبنی اور ایک غیر تعاون پر مبنی معاشرے کے درمیان موجود ہے۔ لہذا

معاشرے کو یہ یقینی بنانا چاہیئے کہ تعاون کے ثمرات تمام شرکاء کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم ہوں۔

لیکن یہ دلیل صرف اس صورت میں درست ہے جب ہم اقتصادی دولت کو ایک گمنام سماجی پیداوار کے طور پر دیکھیں، جس میں انفرادی شراکتوں کو الگ کرنا ناممکن ہو۔ صرف اس صورت میں مصنوعات کے حصص کی تقسیم کے لیے بعد از وقت اصولِ انصاف تیار کرنے کی ضرورت ہو گی۔ لیکن یہ مفروضہ، ایک بار پھر واضح طور پر غلط ہے۔ نام نہاد سماجی پیداوار دراصل انفرادی مصنوعات اور خدمات کا وسیع سلسلہ ہے جو مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ یہ یقیناً ممکن ہے کہ معلوم کیا جائے کہ کوئی فرد کون سی چیز یا خدمت پیدا کرنے میں مددگار رہا ہے۔ اور جب مصنوعات افراد کے گروپ کے ذریعہ تیار کی جاتی ہیں، جیسا کہ کسی فرم میں، تو یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ کس نے کیا کیا۔ آخر کار، ایک آجر کارکنوں کی بے جا خدمات حاصل نہیں کرتا۔ ایک کارکن کی خدمات اس کی کوششوں سے حتمی پیداوار میں متوقع فرق لانے کیلئے حاصل کی جاتی ہیں۔ اس حقیقت کو مساوات پسند خود بھی تسلیم کرتے ہیں جب وہ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ عدم مساوات قابل قبول ہیں اگر وہ زیادہ پیداوار کرنے والوں کے لیے معاشرے کی کل دولت میں اضافے کا محرک ہیں۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ ترغیبات صحیح لوگوں کو دی جا رہی ہیں، جیسا کہ رابرٹ نوزک (Robert Nozick) نے مشاہدہ کیا ہے، یہاں تک کہ مساوات پسند کو بھی یہ ماننا ہو گا کہ ہم انفرادی شراکتوں کے کردار کی شناخت کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ پورے معاشرے میں آمدنی یا دولت کی شماریاتی تقسیم پر انصاف کے تصور کو لاگو کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ہمیں اس تصویر کو چھوڑنا ہو گا

جس میں شفیق والدین ایک بڑا کیک تقسیم کر رہے ہیں اور میز پر موجود تمام بچوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں۔

جب ہم اس تصویر کو چھوڑ دیتے ہیں، تو ٹونی (Tawney)، رالز (Rawls) اور دیگر لوگوں کے پیش کردہ اصول کا کیا ہوتا ہے: وہ اصول کہ عدم مساوات صرف اس صورت میں قابل قبول ہیں جب وہ سب کے مفاد میں ہوں؟ اگر اس کی بنیاد انصاف پر نہیں رکھی جاسکتی، تو اسے انفرادی حیثیت سے دوسروں کے ساتھ ہمارے تعلقات کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم اسے اس روشنی میں دیکھتے ہیں، تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ وہی اصول ہے جو ہم نے فلاحی حقوق کی بنیاد کے طور پر شناخت کیا تھا۔ اصول یہ ہے کہ پیداواری افراد اپنی کوششوں کے نتائج سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں صرف اس شرط پر کہ ان کی کوششیں دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔ پیدا کرنے، تخلیق کرنے یا آمدنی کمانے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو دوسروں کی ضروریات آپ کی کارروائیوں پر ایک رکاوٹ کے طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ آپ کی صلاحیت، آپ کا اقدام، آپ کی عقل، آپ کے مقاصد کے لیے آپ کی وابستگی اور وہ تمام خصوصیات جو کامیابی کو ممکن بناتی ہیں، ذاتی اثاثے ہیں جو آپ کو کم صلاحیت، اقدام کے قابل، عقل یا وابستگی رکھنے والے افراد کے لیے ذمہ دار بناتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں معاشرتی انصاف کی ہر شکل اس مفروضے پر مبنی ہے کہ انفرادی صلاحیت ایک معاشرتی اثاثہ ہے۔ یہ مفروضہ صرف یہ نہیں کہتا کہ فرد اپنی صلاحیتوں کا استعمال دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے کے لیے نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی یہ مفروضہ صرف

یہ کہتا ہے کہ مہربانی یا سخاوت اچھائیاں ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ فرد کو کم از کم جزوی طور پر، دوسروں کی بھلائی کے لیے ایک ذریعہ سمجھنا چاہیئے۔ اور یہاں ہم اس معاملے کے لب ولباب پر پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے حقوق کا احترام کرتے ہوئے، میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ اپنے مقصد میں ہیں اور میں انہیں صرف اپنے اطمینان کے لئے ایک ذریعہ کے طور پر نہیں دیکھ سکتا، جس طرح میں بے جان اشیاء کے ساتھ سلوک کرتا ہوں۔ پھر اپنے آپ کو ختم سمجھنا اور خود کو ایک مقصد کے طور پر دیکھنا اتنا ہی اخلاقی کیوں نہیں؟ میں ایک اخلاقی وجود کے طور پر اپنے وقار کے احترام میں اپنے آپ کو دوسروں کی خدمت کا ذریعہ سمجھنے سے کیوں انکار نہ کروں؟

انفرادی اخلاقیات کی جانب

آئن رینڈ کی سرمایہ داری کے حق میں دلیل ایک فردیت پر مبنی اخلاقیات پر قائم ہے جو کسی کے اپنے مفاد کی پیروی کے اخلاقی حق کو تسلیم کرتی ہے اور ایثار کو جڑ سے مسترد کرتی ہے۔

ایثار پسند استدلال کرتے ہیں کہ زندگی ہمیں ایک بنیادی انتخاب فراہم کرتی ہے: ہمیں یا تو دوسروں کو اپنے لئے قربان کرنا چاہیئے یا خود کو دوسروں کے لیے قربان کرنا چاہیئے۔ مؤخر الذکر ایثار پسندانہ عمل ہے اور مفروضہ یہ ہے کہ واحد متبادل ایک شکاری کے طور پر زندگی ہے۔ لیکن آئن رینڈ کے مطابق یہ ایک غلط متبادل ہے۔ زندگی کسی بھی سمت میں قربانیوں کی ضرورت نہیں رکھتی۔ عقلی لوگوں کے مفادات میں کوئی تنازعہ نہیں ہوتا اور ہمارے حقیقی مفاد کی جستجو کے لیے ضروری ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ پرامن اور رضاکارانہ تبادلے کے ذریعے معاملات کریں۔

یہ سمجھنے کے لیے کہ کیوں، آیئے ہم پوچھتے ہیں کہ ہم اس کا فیصلہ کیسے کرتے ہیں کہ ہمارے مفاد میں کیا ہے۔ ایک مفاد وہ قدر ہے جسے ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں: دولت، خوشی، تحفظ، محبت، خود اعتمادی، یا کوئی اور اچھی چیز۔ آئن رینڈ کی اخلاقی فلسفہ اس بصیرت پر مبنی ہے کہ بنیادی قدر، "summum bonum"، زندگی ہے۔ یہ جانداروں کے وجود ہے، ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مستقل عمل کی ضرورت قدر کے پورے مظہر کو جنم دیتی ہے۔ زندگی کے بغیر دنیا حقائق کی دنیا ہوگی لیکن اقدار کی نہیں، ایک ایسی دنیا جہاں کسی حالت کو دوسری حالت سے بہتر یا بدتر نہیں کہا جاسکتا۔ لہذا بنیادی قدر کا معیار، جس کی بنیاد پر ایک شخص کو اپنے مفاد میں فیصلہ کرنا چاہیئے، اس کی زندگی ہے: محض لمحہ بہ لمحہ بقا نہیں، بلکہ اس کی ضروریات کی مکمل تسکین اس کی صلاحیتوں کے مستقل استعمال کے ذریعے۔

انسان کی بنیادی صلاحیت اس کی بقا کا بنیادی ذریعہ، اس کی عقل ہے۔ یہی عقل ہمیں پیداوار کے ذریعے زندگی گزارنے کی اجازت دیتی ہے، اور اس طرح شکار اور جمع کرنے کی غیر یقینی سطح سے بلند ہونے کی اجازت دیتی ہے۔ عقل زبان کی بنیاد ہے جو ہمیں تعاون اور علم کی منتقلی کو ممکن بناتی ہے۔ عقل مجرد قوانین کے تحت چلنے والے معاشرتی اداروں کی بنیاد ہے۔ اخلاقیات کا مقصد ایسی زندگی گزارنے کے معیارات فراہم کرنا ہے جو عقل کے مطابق ہوں۔

عقل کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے، ہمیں پیداواری صلاحیت کو بھی ایک فضیلت کے طور پر قبول کرنا ہوگا۔ پیداوار کا مطلب قدر پیدا کرنا ہے۔ انسان دوسرے جانوروں کی طرح فطرت میں اپنی ضرورت کو تلاش کرکے محفوظ اور مکمل زندگی نہیں گزار سکتا۔ نہ ہی وہ

دوسروں پر پیراسائیٹ بن کر رہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ رینڈ دلیل دیتی ہیں، 'اگر کچھ لوگ بربریت یا فریب کے ذریعے زندہ رہنے کی کوشش کریں، لوٹ مار، چوری، دھوکہ دہی یا ان لوگوں کو غلام بنا کر جو پیدا کرتے ہیں، تو یہ حقیقت باقی رہتی ہے کہ ان کا زندہ رہنا صرف ان کے شکاروں کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے، صرف ان لوگوں کی وجہ سے جو سوچنے کا انتخاب کرتے ہیں اور ان مال کو پیدا کرتے ہیں جو یہ لٹیرے چھین رہے ہیں۔ ایسے لٹیرے پیراسائٹس ہیں جو بقا کے قابل نہیں ہوتے، جو ان لوگوں کو تباہ کر کے وجود رکھتے ہیں، جو قابل ہوتے ہیں اور جو انسانوں کیلئے ایک مناسب راستہ کرتے ہیں۔'

عام طور پر، خود غرض شخص کو ایک ایسے فرد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے کچھ بھی کرے گا—جو جھوٹ بولے گا، چوری کرے گا اور دوسروں پر حاکمیت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ زیادہ تر لوگوں کی طرح، رینڈ بھی اس طرز زندگی کو غیر اخلاقی سمجھی گی۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خود کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ذاتی خواہش اس بات کا امتحان نہیں ہے کہ آیا کوئی چیز ہمارے مفاد میں ہے، اور دھوکہ دہی، چوری، اور طاقت حاصل کرنا خوشی یا کامیاب زندگی حاصل کرنے کے ذرائع نہیں ہیں۔ جو فضائل میں نے ذکر کیے ہیں وہ معروضی معیار ہیں۔ یہ انسان کی فطرت میں جڑیں رکھتے ہیں اور اس طرح سبھی انسانوں پر لاگو ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا مقصد یہ ہے کہ ہر فرد کو 'اس عظیم قیمت اور اس مقصد جو اس کی اپنی زندگی ہے، کو حاصل کرنے، برقرار رکھنے، پورا کرنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل بنائے۔' لہٰذا اخلاقیات کا مقصد ہمیں یہ بتانا ہے کہ ہمارے حقیقی مفادات کو کیسے حاصل کیا جائے نہ کہ ان کی قربانی کیسے دی جائے۔

تو پھر ہمیں دوسروں کے ساتھ کیسے برتاؤ کرنا چاہیئے؟ رینڈ کی سماجی اخلاقیات دو بنیادی اصولوں پر مبنی ہے: حقوق کا اصول اور انصاف کا اصول۔ حقوق کا اصول کہتا ہے کہ ہمیں دوسروں کے ساتھ امن سے، رضاکارانہ تبادلے کے ذریعے، ان کے خلاف طاقت کا استعمال کیے بغیر برتاؤ کرنا چاہیئے۔ صرف اسی طریقے سے ہم اپنے پیداواری کوششوں کی بنیاد پر آزادانہ طور پر زندگی گزار سکتے ہیں؛ جو شخص دوسروں کو کنٹرول کرنے کے ذریعے زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے وہ پیراسائٹ ہے۔ مزید یہ کہ ایک منظم معاشرے کے اندر اگر ہمیں اپنے حقوق کا احترام کرنے کی خواہش ہو تو دوسروں کے حقوق کا احترام کرنا چاہیئے۔ اور صرف اسی طریقے سے ہم سماجی تعامل سے ملنے والے بہت سے فوائد حاصل کر سکتے ہیں: معاشی اور فکری تبادلے کے فوائد، کے ساتھ ساتھ زیادہ گہرے ذاتی تعلقات کی قدریں۔ ان فوائد کا ذریعہ دوسرے شخص کی عقلیت، پیداواری صلاحیت، انفرادیت ہے اور ان چیزوں کے پروان چڑھنے کے لئے آزادی ضروری ہے۔ اگر میں طاقت کے ذریعے زندہ رہتا ہوں، تو میں ان قدروں کی جڑ پر حملہ کرتا ہوں جن کی مجھے تلاش ہے۔

انصاف کا اصول وہ ہے جسے رینڈ تاجر اصول کہتی ہے: تجارت کے ذریعے زندگی گزارنا، قیمت کے بدلے قیمت پیش کرنا، نہ غیر کمایا ہوا مانگنا اور نہ ہی دینا۔ ایک باعزت شخص اپنی ضروریات کو دوسروں پر دعوے کے طور پر پیش نہیں کرتا؛ وہ کسی بھی تعلق کی بنیاد کے طور پر قیمت پیش کرتا ہے۔ نہ ہی وہ دوسروں کی ضروریات کی خدمت کرنے کے لئے کسی غیر منتخب شدہ ذمہ داری کو قبول کرتا ہے۔ کوئی بھی شخص جو اپنی زندگی کی قدر کرتا ہے وہ اپنے

بھائی کا نگہبان بننے کی کھلی ذمہ داری کو قبول نہیں کر سکتا۔ کوئی خود مختار شخص کسی مالک کے ذریعہ، اور نہ ہی محکمہ صحت اور انسانی خدمات کے ذریعہ اپنے آپ کو پابند رکھنا چاہے گا۔ رینڈ مشاہدہ کرتی ہیں کہ تجارت کا اصول وہ واحد بنیاد ہے جس پر انسان ایک دوسرے کے ساتھ آزادی اور برابری کے طور پر پیش آسکتے ہیں۔

مختصر اًمعروضی یا مقصدیت پر مبنی اخلاقیات (The Objectivist ethics) ایک فرد کو مکمل معنی میں اپنے اندر ایک انجام کے طور پر مانتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ داری واحد عادلانہ اور اخلاقی نظام ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ انفرادی حقوق کی پہچان اور تحفظ پر مبنی ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرے میں مرد اپنے دماغ کے استعمال سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے آزاد ہیں، جیسا کہ کسی بھی معاشرے میں لوگ قدرت کے قوانین کے پابند ہیں۔ خوراک، پناہ گاہ، کپڑے، کتابیں، اور دوا درختوں پر نہیں اگتے؛ انہیں پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اور جیسے کسی بھی معاشرے میں لوگ اپنی فطرت کے حدود سے اپنی انفرادی صلاحیت کی حد تک پابند ہوتے ہیں۔ لیکن سرمایہ داری کی طرف سے عائد کردہ واحد سماجی پابندی یہ ہے کہ جو لوگ دوسروں کی خدمات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں، انہیں بدلے میں قیمت پیش کرنی ہوگی۔ کوئی بھی ریاست کو استعمال کرکے دوسروں کی پیداوار کو ضبط نہیں کر سکتا۔

بازار میں معاشی نتائج، آمدنی اور دولت کی تقسیم تمام شرکاء کی رضاکارانہ کارروائیوں اور تعاملات پر منحصر ہوتے ہیں۔ انصاف کا تصور نتیجے پر نہیں بلکہ معاشی سرگرمی کے عمل پر لاگو ہوتا ہے۔ کسی شخص کی آمدنی اس صورت میں جائز ہے اگر وہ رضاکارانہ تبادلے کے ذریعے حاصل کی گئی ہو جو پیش کی جانے والی قدر کے صلے میں ہو، جیسا کہ اس کو پیش کرنے والوں کی

نظر میں جائز ہو۔ ماہرینِ معاشیات طویل عرصے سے جانتے ہیں کہ کسی چیز کی قیمت کا کوئی عادلانہ تصور نہیں ہوتا، سوائے اس کے جو بازار کے شرکاء اس چیز کی قدر کے بارے میں کرتے ہیں۔ یہی بات انسانی پیداواری خدمات کے معاوضے کے بارے میں بھی درست ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنی قیمت اپنی آمدنی سے ناپنی چاہیے، بلکہ صرف یہ کہ اگر میں دوسروں کے ساتھ تجارت کے ذریعے جینا چاہتا ہوں تو میں ان سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے مفادات کی قربانی دے کر میری شرائط قبول کریں۔

احسان بطور ایک منتخب قدر

کیا ہو گا اگر کوئی شخص غریب، معذور یا خود کفیل نہ ہو سکے؟ یہ پوچھنے کیلئے ایک جائز سوال ہے، جب تک کہ یہ کسی معاشرتی نظام کے بارے میں پہلا سوال نہ ہو۔ یہ سوچنا ایثار کا ورثہ ہے کہ کسی معاشرے کا بنیادی معیار وہ ہے جس سے وہ اپنے کم ترین پیداواری ارکان کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے۔ عیسیٰ (علیہ السلام) نے کہا، "مبارک ہیں وہ جو روح کے غریب ہیں، بردباروں (حلیموں) کو مبارک ہو۔" لیکن انصاف میں غریب یا حلیم کو کسی خاص عزت دینے یا ان کی ضروریات کو بنیادی سمجھنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اگر ہمیں ایک اشتراکی معاشرے میں انتخاب کرنا ہو جہاں کوئی آزاد نہ ہو لیکن کوئی بھوکا نہ ہو، اور ایک انفرادیت پسند معاشرے میں جہاں ہر کوئی آزاد ہو لیکن کچھ لوگ بھوک کا سامنا کریں، تو میں یہ دلیل دوں گا کہ دوسرا معاشرہ، آزاد والا، اخلاقی انتخاب ہے۔ کوئی بھی دوسرے سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ وہ اس کی خدمت کرنے کے لئے مجبور ہو، چاہے اس کی اپنی زندگی اس پر منحصر ہو۔ لیکن یہ وہ انتخاب نہیں ہے جو ہمیں درپیش ہے۔ حقیقت میں، غریب افراد سرمایہ داری کے تحت سوشلزم یا فلاحی ریاست کے مقابلے میں بہت بہتر ہوتے ہیں۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ

وہ معاشرے جہاں کوئی آزاد نہیں ہوتا، جیسے سابق سوویت یونین، وہاں بڑی تعداد میں لوگ بھوکے رہتے ہیں۔

جو افراد کام کرنے کے قابل ہیں ان کا معاشی اور تکنیکی ترقی میں ایک اہم مفاد ہوتا ہے جو کہ مارکیٹ آرڈر میں تیزی سے ہوتی ہے۔ سرمایہ کاری اور مشینری کا استعمال ایسے لوگوں کو ملازمت دینا ممکن بناتا ہے جو بصورت دیگر اپنی کفالت کے لیے کافی پیداوار نہیں کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر کمپیوٹر اور مواصلاتی آلات نے اب شدید معذور افراد کو ان کے گھروں سے کام کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو بالکل کام نہیں کر سکتے، آزاد معاشرے ہمیشہ بازار سے باہر نجی امداد اور فلاحی تنظیموں، خیراتی انجمنوں اور اسی طرح کی دیگر متعدد شکلیں فراہم کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں واضح رہے کہ خودغرضی اور خیرات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے سے حاصل ہونے والے بے شمار فوائد کے پیش نظر، اپنے ہم انسانوں کے ساتھ عمومی خیر خواہی کے جذبے سے پیش آنا، ان کی بدحالیوں سے ہمدردی کرنا، اور اپنی دلچسپیوں کی قربانی کے بغیر مدد دینا فطری بات ہے۔ لیکن ایک خودغرض اور ایثار پسند خیرات کے تصور میں بڑے فرق ہیں۔

ایک ایثار پسند کے لئے دوسروں کے لئے سخاوت ایک بنیادی اخلاقی اصول ہے، اور اس اصول پر کہ "جب تک اسے تکلیف نہ ہو دے دو"، اسے قربانی کی حد تک لے جانا چاہیئے۔ دینا ایک اخلاقی فرض ہے اور وصول کنندہ اس کا حق رکھتا ہے، قطع نظر اس کے کہ کسی کے پاس دوسرے اقدار ہوں۔ ایک خودغرض کے لئے بشمول دوسروں کی بھلائی کے لئے دی

جانے والی قدر، سخاوت اپنے اقدار کا تعاقب کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ "جب اس کی مدد ہو رہی ہو تو دو" کے اصول پر اسے اپنے دیگر اقدار کے تناظر میں کیا جانا چاہیئے۔ یہ کوئی فرض نہیں اور نہ ہی وصول کنندہ اس کا حق رکھتے ہیں۔ ایک ایثار پسند سخاوت کو جرم کے کفارے کے طور پر دیکھتا ہے، اس مفروضے پر کہ قابل ہونا، کامیاب ہونا، پیداواری ہونا، یا دولت مند ہونا کچھ گناہگار یا مشکوک چیز ہے۔ ایک خود غرض ان ہی خصوصیات کو خوبی سمجھتا ہے اور ان میں فخر کے اظہار کے طور پر سخاوت کو دیکھتا ہے۔

چوتھا انقلاب

میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ سرمایہ داری تین انقلابات کا نتیجہ تھی، جن میں سے ہر ایک ماضی سے ایک بنیادی بغاوت تھی۔ سیاسی انقلاب نے انفرادی حقوق کی فوقیت اور اس اصول کو قائم کیا کہ حکومت انسان کی خدمت گزار ہے، اس کی آقا نہیں۔ اقتصادی انقلاب نے بازاروں کی سمجھ کو فروغ دیا۔ صنعتی انقلاب نے پیداوار کے عمل میں عقل کے استعمال کو انتہائی وسیع کیا۔ لیکن انسانیت نے کبھی اپنے اخلاقی ماضی سے ناطہ نہیں توڑا۔ یہ اخلاقی اصول کہ انفرادی صلاحیت ایک سماجی اثاثہ ہے، ایک آزاد معاشرے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر آزادی کو بقا اور فروغ پانا ہے تو ہمیں ایک چوتھے انقلاب کی ضرورت ہے، ایک اخلاقی انقلاب، جو فرد کے اپنے لیے جینے کے اخلاقی حق کو قائم کرے۔

باب نمبر 3
دولت کی پیداوار
اور تقسیم

مارکیٹ معیشت اور دولت کی تقسیم

مصنف: لڈوِگ لچمن (Ludwig Lachmann)

اس مضمون میں ممتاز ماہر اقتصادیات لڈوِگ لچمن (Ludwig Lachmann) آزاد منڈی کی سرمایہ داری پر "سماجی انصاف" کی تنقیدوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کی عدم مطابقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ "ملکیت" اور "دولت" کے درمیان فرق کی وضاحت کرتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ کس طرح جائیداد (ملکیت) کا احترام بازار کے ذریعے دولت کی وسیع پیمانے پر تقسیم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ یہ مضمون سرمایہ داری کے نظام میں سماجی اور اقتصادی تعلقات کی متحرک نوعیت کو سمجھنے کے لئے اہم ہے۔

لڈوِگ لچمن (1906-1990) نے برلن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے 1933 میں جرمنی چھوڑ کر انگلینڈ کا رخ کیا، جہاں انہوں نے لندن اسکول آف اکنامکس میں اپنی تحقیق جاری رکھی۔ لاچمن نے سرمائے کے نظریئے، اقتصادی ترقی اور اقتصادیات اور سماجیات کے طریقہ کار کی بنیادوں میں خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔ ان کے تصانیف میں Capital and Its Structure، The Legacy of Max Weber، Macro-Economic Thinking and the Market Economy، Capital, Expectations, and the Market Process، اور The Market as an Economic Process شامل ہیں۔

یہ اس اصل مضمون کا ایک مختصر ورژن ہے جو کہ پہلی بار 1956 میں شائع ہوا تھا۔

پروفیسر مائسز کی اس بات پر اب کون شک کر سکتا ہے جسکی نشاندہی انہوں نے تیس سال قبل کی تھی کہ، ہر سیاسی اختیار کی مداخلت کا نتیجہ پہلے قدم کے ناگزیر معاشی اثرات کو روکنے کے لیے مزید مداخلت کی صورت میں نکلتا ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک کمانڈ معیشت کو چلانے کے لیے افراطِ زر کا ماحول ضروری ہے، اور آج کون "کنٹرول شدہ افراطِ زر" کے مضر اثرات سے ناواقف ہے؟ اگرچہ کچھ ماہرین اقتصادیات نے اب اس مستقل افراطِ زر کو بیان کرنے کے لئے "سیکولر افراطِ زر" (secular inflation) کی اصطلاح ایجاد کی ہے جسے ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں اور یہ امکان نہیں ہے کہ کوئی دھوکہ کھائے گا۔ ہمیں یہ ثابت کرنے کے لئے اس حالیہ جرمن مثال کی ضرورت نہیں تھی کہ ایک بازار معیشت حتیٰ کہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی "انتظامی طور پر کنٹرول شدہ" انتشار سے آرڈر پیدا کرے گی۔ ایک اقتصادی تنظیم کی شکل جو رضاکارانہ تعاون اور علم کے عالمی تبادلے پر مبنی ہو، کسی بھی درجہ بندی کی ڈھانچے سے لازمی طور پر برتر ہے، حتیٰ کہ اگر اس میں حکم دینے والوں کے قابلیت کے لئے کوئی معقول آزمائش بھی موجود ہو۔ جو لوگ عقل اور تجربے سے سیکھنے کے قابل ہیں، وہ پہلے سے جانتے تھے، اور جو نہیں ہیں، ان کے لئے اب بھی سیکھنا مشکل ہو گا۔

اس صورتحال کا سامنا کرتے ہوئے، مارکیٹ معیشت کے مخالفین نے اپنی بنیاد تبدیل کر دی ہے؛ وہ اب اس کی مخالفت "معاشی" کے بجائے "سماجی" بنیادوں پر کر رہے ہیں۔ وہ اسے ناکارہ کی بجائے غیر منصفانہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اب دولت کی ملکیت کے "بگاڑنے والے اثرات" پر توجہ دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ "مارکیٹ کی رائے شماری کثرت رائے دہی سے متاثر ہوتی ہے۔" وہ ظاہر کرتے ہیں کہ دولت کی تقسیم پیداوار اور آمدنی کی تقسیم کو متاثر کرتی ہے کیونکہ دولت کے مالکان نہ صرف معاشرتی آمدنی کا "غیر منصفانہ حصہ" وصول

کرتے ہیں بلکہ وہ معاشرتی مصنوعات کی ترکیب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں: عیش و عشرت کی چیزیں بہت زیادہ اور ضروریات کم ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ چونکہ یہ مالکان زیادہ تر بچت کرتے ہیں، اس لیے وہ سرمائے کے جمع ہونے کی شرح کا تعین بھی کرتے ہیں اور اس طرح معاشی ترقی بھی کرتے ہیں۔

ان میں سے کچھ مخالفین اس بات سے یکسر انکار نہیں کریں گے کہ دولت کی تقسیم ایک حد تک معاشی قوتوں کے کھیل کا نتیجہ ہے، لیکن ان کا ماننا ہے کہ یہ جمعیت اس طرح کام کرتی ہے کہ ماضی کا ایک بوسیدہ اور غیر یقینی عنصر حال میں داخل ہوتا ہے جو موجودہ وقت کو ماضی کا غلام بناتی ہے۔ آج کی آمدنی کی تقسیم آج کی دولت کی تقسیم سے شکل پذیر ہے، اور حالانکہ آج کی دولت جزوی طور پر کل جمع کی گئی تھی، یہ ایسے عملوں کے ذریعے جمع کی گئی تھی جو پرسوں کے دن کی دولت کی تقسیم کے اثرات کی عکاسی کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر مارکیٹ اکانومی کے مخالفین کی یہ دلیل "وراثت" کے نظریئے پر مبنی ہے جس کے بارے میں ایک ترقی پسند معاشرے میں بھی ہمیں بتایا جاتا ہے کہ مالکان کی اکثریت اسی کے سبب اپنی دولت حاصل کرتے ہیں۔

یہ دلیل آج کے دور میں وسیع پیمانے پر قبول کی جاتی ہے حتیٰ کہ بہت سارے ان لوگوں کی جانب سے بھی جو واقعی اقتصادی آزادی کے حق میں ہیں۔ ایسے لوگ یہ یقین کرنے لگے ہیں کہ دولت کی "دوبارہ تقسیم"، مثلاً موت پر لگائے جانے والے ٹیکسوں کے ذریعے معاشرتی طور پر مطلوبہ نتائج دے گی لیکن اس کے کوئی منفی اقتصادی نتائج نہیں ہوں گے۔ اس کے برعکس، چونکہ ایسے اقدامات ماضی کے "مردہ ہاتھ" سے حال کو آزاد کرنے میں مدد کریں

گے اور اس سے موجودہ آمدنی کو موجودہ ضروریات کے مطابق ایڈجسٹ کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ دولت کی تقسیم بازار کے اعداد و شمار (ڈیٹم / معلومات) ہیں اور بازار کے میکانزم میں مداخلت کئے بغیر اعداد و شمار کو تبدیل کر کے ہم نتائج کو تبدیل کر سکتے ہیں! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب موجودہ دولت کی مسلسل دوبارہ تقسیم کی پالیسی ساتھ ہو تو اس وقت بازار کا عمل "سماجی طور پر قابل برداشت" نتائج پیدا کرے گا۔

جیسا کہ ہم نے کہا آج یہ نظریہ بہت سے لوگوں کے پاس ہے، یہاں تک کہ کچھ ماہرین اقتصادیات میں بھی جو بازار کی معیشت کی کمانڈ معیشت پر برتری اور مداخلت پسندی کی ناکامیوں کو سمجھتے ہیں، لیکن بازار کی معیشت کے معاشرتی نتائج کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ بازار کی معیشت کو صرف اس صورت میں قبول کرنے کے لئے تیار ہیں جب اس کے ساتھ دولت کی دوبارہ تقسیم کی ایسی پالیسی بھی موجود ہو۔ موجودہ مضمون اس نقطہ نظر کی بنیاد کی تنقید کے لئے مختص ہے۔

پہلی بات یہ ہے پوری دلیل منطقی طور پر لفظی الجھن پر منحصر ہے جو اصطلاح "ڈیٹم" (Datum) کے مبہم معنی سے پیدا ہوتی ہے۔ عام استعمال اور بیشتر علوم میں مثلاً شماریات میں، لفظ "ڈیٹم" کا مطلب ایک ایسی چیز ہے جو وقت کے ایک لمحے میں ہمیں منظر کے مبصر کے طور پر "دیا گیا" ہے۔ اس معنی میں، یہ یقیناً ایک حقیقت ہے کہ کسی دیے گئے لمحے میں دولت کی تقسیم کا طریقہ ایک "ڈیٹم" ہے، صرف اس معمولی معنی میں کہ یہ موجود ہوتا ہے اور کوئی دوسرا طریقہ موجود نہیں ہوتا۔ لیکن توازن کے نظریات میں، جو کسی نہ کسی طرح سے موجودہ دور کے اقتصادی خیالات کے لیے بہت اہم ہو چکے ہیں اور جنھوں نے اس کے

مواد کو بڑے پیمانے پر تشکیل دیا ہے، لفظ "ڈیٹم" نے ایک دوسرا اور بہت مختلف معنی حاصل کر لیا ہے: یہاں "ڈیٹم" کا مطلب توازن کی ایک لازمی شرط ہے، ایک آزاد متغیر، اور "ڈیٹا" مجموعی طور پر ان تمام ضروری اور کافی حالات کا مجموعہ ہیں، جن کو ایک بار جب ہم جان لیتے ہیں تو ان سے ہم مزید کسی تکلیف کے بغیر توازن کی قیمت اور مقدار کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں دوسرے اعداد و شمار کے ساتھ اس طرح دولت کی تقسیم، خریدی اور فروخت کی جانے والی مختلف خدمات اور مصنوعات کی قیمتوں اور مقدار کا تعین کرنے والا ہو گی، اگرچہ صرف ایک ہی نہیں ہے۔

تاہم، اس مضمون میں ہمارا بنیادی کام یہ دکھانا ہو گا کہ دولت کی تقسیم اس دوسرے معنی میں ایک "ڈیٹم" نہیں ہے۔ بازار کے عمل کا ایک "آزاد متغیر" ہونے کی بجائے یہ مسلسل بازار کی قوتوں کے ذریعے ترمیم کا شکار رہتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں ہے کہ کسی بھی وقت یہ ان قوتوں میں سے ہے جو مستقبل قریب میں مارکیٹ کے عمل کی راہ کو تشکیل دیتی ہیں، بلکہ اس بات سے انکار کرنا ہے کہ اس طرح کی تقسیم کا طریقہ کوئی مستقل اثر ڈال سکتا ہے۔ اگرچہ دولت کو ہمیشہ کسی نہ کسی طریقے سے تقسیم کیا جاتا ہے، لیکن اس تقسیم کا طریقہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔

صرف اس صورت میں جب تقسیم کا طریقہ مدت کے بعد ایک ہی رہے، جبکہ دولت کے انفرادی ٹکڑے وراثت کے ذریعے منتقل ہو رہے ہوں، اس طرح کے مستقل موڈ کو ایک مستقل معاشی قوت کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ دولت کی تقسیم بازار کی قوتوں کے ذریعے ایک شے کے طور پر تشکیل پاتی ہے، نہ کہ ایک کارندے کے طور پر، اور آج جو

بھی اس کا طریقہ ہو، وہ جلد ہی ایک غیر متعلق ہو جائے گا۔

لہٰذا، دولت کی تقسیم کو توازن کے اعداد و شمار میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔ لیکن جو اقتصادی اور سماجی طور پر بہت اہمیت کا حامل ہے وہ کسی خاص لمحے میں دولت کی تقسیم کا طریقہ نہیں، بلکہ وقت کے ساتھ اس کا تبدیلی کا طریقہ ہے۔ ایسی تبدیلی، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، ان واقعات میں اپنا حقیقی مقام پاتی ہے جو اس مسائل سے بھرپور "راستے" پر ہوتے ہیں، جو شاید ہی، لیکن شاذ و نادر ہی حقیقت میں توازن کا باعث بنے۔ یہ ایک عموماً "متحرک" مظہر ہے۔ یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ ایک وقت میں جب متحرک مطالعہ کے حصول اور فروغ کی ضرورت کے بارے میں اتنی باتیں ہو رہی ہیں، یہ اتنی کم دلچسپی کیوں پیدا ہو رہی ہے۔

ملکیت ایک قانونی تصور ہے جو ٹھوس مادی اشیاء سے متعلق ہے۔ دولت ایک اقتصادی تصور ہے جو نایاب یا قلیل وسائل سے متعلق ہے۔ تمام قیمتی وسائل مادی اشیاء پر مشتمل ہوتے ہیں، ان کی عکاسی کرتے ہیں، یا ان میں شامل ہوتے ہیں، لیکن تمام مادی اشیاء وسائل نہیں ہوتیں: بوسیدہ مکان اور پرانے کباڑ کے ڈھیر واضح مثالیں ہیں، جیسا کہ کوئی بھی ایسی چیز ہے جسے اگر کوئی ہٹانے کیلئے تیار ہو تو اس کے مالکان بخوشی دے دیں گے۔ مزید یہ کہ، جو آج ایک وسیلہ ہے وہ کل نہیں رہ سکتا، جبکہ جو آج بے قیمت چیز ہے وہ کل قیمتی بن سکتی ہے۔ مادی اشیاء کی مالی حیثیت ہمیشہ پیچیدہ رہتی ہے اور کسی حد تک دور اندیشی پر منحصر ہوتی ہے۔ ایک چیز دولت اسی وقت کہلاتی ہے جب وہ آمدنی کا ذریعہ ہو۔ مالک کے لیے اس شے کی قدر، موجودہ یا ممکنہ، اس کی متوقع آمدنی پیدا کرنے کی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ اپنی باری میں اس چیز کے استعمال پر منحصر ہو گا۔ اس لیے اشیاء کی صرف ملکیت لازمی طور پر دولت فراہم نہیں کرتی:

بلکہ ان کا کامیاب استعمال ہی دولت فراہم کرتا ہے۔ وسائل کا استعمال ہی آمدنی اور دولت کا ذریعہ ہے نہ کہ ان کی ملکیت۔ نیویارک میں آئس کریم کی فیکٹری اس کے مالک کے لیے دولت ہو سکتی ہے؛ لیکن وہی آئس کریم کی فیکٹری گرین لینڈ میں شاید ہی کوئی وسیلہ ہو گی۔

غیر متوقع تبدیلیوں کی دنیا میں دولت کا برقرار رہنا ہمیشہ پیچیدہ ہوتا ہے؛ اور طویل مدت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ ایک خاندان کو دولت کی ایک مخصوص مقدار برقرار رکھنے کے قابل ہونے کے لیے، جو کہ وراثت کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کی جا سکتی ہو، ایسے وسائل کا مالک ہونا پڑے گا جو مستقل خالص آمدنی کا سلسلہ پیدا کریں، یعنی کہ پیداوار کی قدر کے اضافے کا سلسلہ جو کہ وسائل کے ساتھ شامل عوامل کی خدمات کی لاگت پر سبقت رکھتا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ صرف یا تو ایک ساکن دنیا میں ممکن ہو گا، ایک ایسی دنیا جہاں آج کل جیسا ہو اور کل آج جیسا ہو، اور جہاں ہر روز اور ہر سال، وہی آمدنی وہی مالکان یا ان کے وارثوں کو حاصل ہو گی؛ یا اگر تمام وسائل کے مالکوں کے پاس کامل دور اندیشی ہو۔ چونکہ دونوں صورتیں حقیقت سے بہت دور ہیں، اس لیے ہم انہیں نظر انداز کر سکتے ہیں۔ پھر حقیقت میں غیر متوقع تبدیلیوں کی دنیا میں دولت کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟

تمام دولت ایسے سرمایہ جاتی اثاثوں پر مشتمل ہوتی ہے جو کسی نہ کسی طرح یا کم از کم پیداوار کے مادی وسائل اور قیمتی پیداوار کے ذرائع کی عکاسی کرتی ہے۔ تمام پیداوار انسانی محنت کے ذریعے ان وسائل کے امتزاج کی مدد سے تیار کی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے وسائل کو مخصوص امتزاج میں استعمال کرنا ہوتا ہے؛ تکمیل وسائل کے استعمال کا جوہر ہے۔ اس تکمیل کے طریقوں کو کسی بھی طرح سے ان کاروباریوں کو نہیں دیا جاتا ہے جو پیداواری منصوبے

بناتے ہیں، شروع کرتے ہیں اور ان پر عمل درآمد کرتے ہیں۔ حقیقت میں پیداوار کی کوئی مخصوص ترکیب جیسی کوئی ایسی شے نہیں ہے۔ اس کے برعکس، کاروباری شخص کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تبدیل ہوتی ہوئی دنیا میں یہ تلاش کرے کہ کون سے وسائل کا امتزاج آج کے حالات میں زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ہو گا اور یہ اندازہ بھی لگائے کہ کل کے ممکنہ حالات میں جب پیداوار کی قدریں مکمل کرنے کی لاگت اور ٹیکنالوجی سب بدل چکے ہوں گے، یہ کس طرح ہو گا۔

اگر تمام سرمائے کے وسائل انتہائی لچکدار ہوتے، تو کاروباری مسئلہ صرف بیرونی حالات کی تبدیلیوں کے مطابق وسائل کے امتزاج کو ان تبدیلیوں کے ذریعے فائدہ مند استعمالات میں تبدیل کرنے پر مشتمل ہوتا۔ جیسا کہ وسائل میں عموماً لچک کی حد محدود ہوتی؛ ہر ایک مخصوص کئی استعمالات کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ لہٰذا، تبدیلی کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کی ضرورت اکثر وسائل کے گروپ کی ساخت میں تبدیلی کی ضرورت کو جنم دیتی ہے، جسے "سرمایہ کی تنظیم نو(capital regrouping)" کہا جاتا ہے۔ تاہم، باہمیت کے طریقے میں ہر تبدیلی اجزاء وسائل کی قیمت کو متاثر کرے گی، جو سرمایہ کے فوائد اور نقصانات کو جنم دے گی۔ کاروباری لوگ ان وسائل کی خدمات کے لیے زیادہ بولی دیں گے جن کے لیے انہوں نے زیادہ منافع بخش استعمالات تلاش کیے ہیں اور جنہیں کم منافع بخش استعمالات میں تبدیل کرنا پڑتا ہے ان کیلئے کم بولی دیں گے۔

اس حتمی صورت میں جہاں کسی (موجودہ یا ممکنہ مستقبل) ایسے وسائل کے استعمال کے لئے

کوئی وسیلہ نہ مل سکے، جو اب تک منافع بخش امتزاج کا حصہ بنا ہوا ہے، یہ وسیلہ اپنے وسائل کی خصوصیت کو یکسر کھو دے گا۔ لیکن کم سنگین حالات میں بھی، پائیدار اثاثوں پر کیے گئے سرمایہ کے فوائد اور نقصانات غیر متوقع تبدیلی کی دنیا کا ناگزیر نتیجہ ہیں۔

اس طرح مارکیٹ کے عمل کو ایک سطحی عمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ منڈی کی معیشت میں دولت کی دوبارہ تقسیم کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے، جس کے سامنے وہ ظاہری طور پر مشابہ عمل، جنہیں جدید سیاست دانوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ان کا آغاز کریں، موازنہ کی اہمیت کھو دیتے ہیں، اگر کوئی اور وجہ نہ ہو تو یہ کہ مارکیٹ دولت ان لوگوں کو دیتی ہے جو اسے سنبھال سکتے ہیں، جبکہ سیاست دان اسے اپنے حلقہ بگوشوں کو دیتے ہیں جو عام طور پر اسے سنبھال نہیں سکتے۔

دولت کی دوبارہ تقسیم کا یہ عمل حادثاتی واقعات کے ایک سلسلے کی طرف سے نہیں چلایا جاتا۔ جو لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں وہ کوئی قسمت کی بازی نہیں کھیل رہے، بلکہ ایک مہارت کی بازی کھیل رہے ہیں۔ یہ عمل، تمام حقیقی متحرک عملوں کی طرح، ذہن سے دماغ تک علم کی منتقلی کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے صرف اس لیے کہ کچھ لوگوں کے پاس وہ علم ہوتا ہے جو دوسرے لوگوں نے ابھی تک حاصل نہیں کیا ہوتا۔ آخرکار، تبدیلی کا علم اور اس کے نتائج کا پھیلاؤ بتدریج اور غیر ہموار طور پر پورے معاشرے میں پھیلتا ہے۔

اس عمل میں وہ شخص کامیاب ہوتا ہے اور دوسروں سے پہلے سمجھتا ہے کہ ایک خاص وسیلہ جو آج نئی حالت میں تیار کیا جا سکتا ہے، یا خریدا جا سکتا ہے، جب وہ ایک موجودہ وسیلہ ہوتا ہے، ایک مخصوص قیمت A پر کل ایک پیداواری امتزاج کا حصہ بن جائے گا جس کے نتیجے میں

اس کی قیمت "A" ہو گی۔ ایسے سرمایہ کے فوائد یا نقصانات جو وسائل کو ایک استعمال سے دوسرے بہتر یا پہلے سے کمتر میں تبدیل کرنے کی ضرورت یا موقع سے پیدا ہوتے ہیں، وہی ایک تبدیل ہوتی دنیا میں دولت کے مفہوم کے اقتصادی جوہر اور دوبارہ تقسیم کے عمل کے اہم ذرائع ہیں۔

اس عمل میں، یہ انتہائی ناممکن ہے کہ ایک ہی شخص بار بار موجودہ یا ممکنہ وسائل کے نئے ممکنہ استعمالات کے بارے میں اپنے اندازے میں درست رہے، جب تک کہ وہ غیر معمولی ہو۔ اور اگر ایسا ہے تو اس کے وارثوں کا اسی طرح کی کامیابی دکھانا بھی غیر معمولی ہے، جب تک کہ وہ بھی غیر معمولی نہ ہوں۔ ایک غیر متوقع تبدیلی کی دنیا میں، سرمایہ کاری کے نقصانات بالآخر اتنے ہی ناگزیر ہیں جتنے کے فوائد۔

سرمائے کے مالکان کے درمیان مقابلہ اور پائیدار وسائل کی مخصوص نوعیت چاہے وہ "کئی مختلف خصوصیات" ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ فائدے کے بعد نقصان ہوتا ہے جیسے نقصان کے بعد فائدہ ہوتا ہے۔ ان اقتصادی حقائق کے کچھ سماجی نتائج ہوتے ہیں۔ آج کل مارکیٹ معیشت کے نقاد "سماجی" بنیادوں پر اپنی جگہ لینا پسند کرتے ہیں، اس لیے یہاں مارکیٹ عمل کے حقیقی سماجی نتائج کو واضح کرنا نامناسب نہیں ہو گا۔ ہم نے پہلے ہی اسے ایک سطحی عمل کے طور پر بیان کیا ہے۔ زیادہ مناسب طریقے سے ہم اب ان نتائج کو ان کے طور پر بیان کر سکتے ہیں جنہیں پاریتو (Pareto) نے "اشرافیہ کی گردش" کہا ہے۔ دولت کا ایک ہی ہاتھوں میں زیادہ دیر تک رہنا ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہے جیسے کہ غیر متوقع تبدیلیاں کسی خاص وسائل کی قدر کو بڑھاتی ہیں، جس سے سرمایہ

میں منافع اور نقصان پیدا ہوتا ہے۔ ہم شاید شُمپیٹر (Schumpeter) کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دولت کے مالک ہوٹل کے مہمانوں یا ٹرین کے مسافروں کی طرح ہوتے ہیں: وہ ہمیشہ وہاں موجود ہوتے ہیں لیکن کبھی زیادہ دیر تک ایک ہی لوگ ان میں نہیں ہوتے۔

ایک مارکیٹ معیشت میں، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، کہ ساری دولت مشکوک نوعیت کی ہوتی ہے۔ جتنے زیادہ دیرپا اثاثے ہوں اور جتنے زیادہ مخصوص ہوں، انہیں استعمال میں لانے کے مواقع محدود ہوں تو مسئلہ زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسی سوسائٹی میں جہاں مستقل سرمایہ کم ہو اور زیادہ تر جمع شدہ دولت اشیاء کے ذخائر کی شکل میں ہو، جو زیادہ تر زرعی اور جلد خراب ہونے والی ہوتی ہیں، مختلف اوقات تک محفوظ کی جاتی ہیں، اور جہاں مکانات اور فرنیچر کے سوا دیرپا صارفین کی اشیاء تقریباً موجود نہ ہوں، تو مسئلہ اتنا نمایاں نہیں ہوتا۔ یہ وہ معاشرت تھی جس میں کلاسیکی ماہرین معیشت رہتے تھے اور جس سے انہوں نے قدرتی طور پر بہت سی خصوصیات مستعار لی تھیں۔

لہٰذا، ان کے وقت کی حالت میں، کلاسیکی ماہرین معیشت ایک حد تک تمام سرمائے کو عملی طور پر ہم جنس اور بالکل متنوع سمجھنے میں حق بجانب تھے، انہوں نے اسے زمین سے متضاد کیا جو واحد مخصوص اور غیر قابل تکرار وسیلہ ہے۔ لیکن ہمارے دور میں اس طرح کی تقسیم کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔ جتنا زیادہ فکسڈ سرمایا ہو، اور جتنا زیادہ دیرپا ہو، اس بات کا امکان اتنا ہی زیادہ ہے کہ اس طرح کے سرمایہ وسائل کو، اس سے پہلے کہ وہ ختم ہو جائیں، ان مقاصد کے لیے استعمال کرنا پڑے گا جن کے لیے وہ اصل میں ڈیزائن کیے گئے تھے۔ اس کا عملی

مطلب یہ ہے کہ ایک جدید منڈی کی معیشت میں مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ پائیداری اور محدود تنوع اسے ناممکن بنادیتے ہیں۔

اس مقالے میں ہم نے جس بنیادی حقیقت پر زور دیا ہے، وہ ہے بازار کی طاقتوں کے سبب غیر متوقع تبدیلیوں کے باعث دولت کی دوبارہ تقسیم کا ہے اور یہ ایک عام مشاہدے کی حقیقت ہے۔ تو پھر، کیوں اسے مستقل طور پر نظرانداز کیا جارہاہے؟ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ سیاست دان اسے نظرانداز کیوں کرتے ہیں: آخر کار، ان کے زیادہ تر ووٹرز اس سے براہ راست متاثر ہونے کا امکان نہیں رکھتے اور جیسا کہ افراط زر کے معاملے میں یہ واضح ہوتا ہے اگر وہ متاثر بھی ہوں تو انہیں اسے سمجھنے میں دشواری ہوگی۔ لیکن معاشی ماہرین اسے کیوں نظرانداز کرتے ہیں؟ یہ بات کہ دولت کی تقسیم کا طریقہ اقتصادی طاقتوں کے عمل کا نتیجہ ہے، ایک ایسی دلیل ہے جو ان کے لئے دلکش ہونی چاہئے۔ پھر کیوں بہت سے معاشی ماہرین دولت کی تقسیم کو "دوسرے معنی میں "ایک "ڈیٹم" کے طور پر دیکھتے ہیں؟ ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ اس کی وجہ حد سے زیادہ توازن کے مسائل پر توجہ دینی چاہیئے۔

ہم نے پہلے دیکھا کہ دولت کی تقسیم کے یکے بعد دیگرے طریقوں کا تعلق عدم توازن کی دنیا سے ہے۔ بنیادی طور پر سرمایہ کے نفع و نقصان اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ دیرپا وسائل کو ان طریقوں سے استعمال کرنا پڑتا ہے جن کے لئے ان کی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی، اور کیونکہ کچھ لوگ دوسرے لوگوں سے بہتر اور پہلے سمجھتے ہیں کہ ایک متحرک دنیا کی بدلتی ضروریات اور وسائل کیا اشارہ دیتے ہیں۔ توازن کا مطلب ہے منصوبوں کی ہم آہنگی لیکن بازار کی وجہ سے دولت کی دوبارہ تقسیم عموماً غیر متوازن عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے

لئے جو توازن کی اصطلاحات میں سوچنے کی تربیت رکھتے ہیں، شاید یہ فطری بات ہو کہ جن عملوں کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ "قابل "نہ دکھائی دیں۔ ان کے لئے، "حقیقی" اقتصادی طاقتیں وہ ہیں جو توازن قائم کرنے اور برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ غیر توازن میں کام کرنے والی طاقتوں کو کم دلچسپ سمجھا جاتا ہے اور اس لئے انہیں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ جدید معاشی ماہر جو توازن کی گرامر میں ماہر ہیں، بازار کے حقائق سے ناواقف ہیں اور اقتصادی تبدیلی کا مقابلہ کرنے کے قابل یا تیار نہیں ہیں؛ یہ ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ صرف ان قسم کی تبدیلیوں سے نمٹنے کے لئے تیار ہیں جو ایک کافی سخت پیٹرن کے مطابق ہوتی ہیں۔

سیاسی اور معاشی آزادی مل کر انسانیت کے معجزات کو جنم دیتی ہے

تیمبا اے. نولتشنگو
(Temba A. Nolutshungu)

اس مضمون میں، جنوبی افریقہ کے معیشت دان تیمبا اے. نولتشنگو اپنے ملک کی حالیہ تاریخ سے مثالیں پیش کرتے ہیں تا کہ اکثریت کی حکمرانی (جو اقلیت کی طاقت کی اجارہ داری کے خلاف دہائیوں کی جدوجہد کے بعد حاصل کی گئی) اور آزادی کے درمیان فرق واضح کیا جا سکے اور اقتصادی آزادی کی آزادانہ صلاحیت کو دکھایا جا سکے۔

تیمبا اے. نولتشنگو جنوبی افریقہ میں فری مارکیٹ فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر ہیں۔ وہ پورے ملک میں اقتصادی امپاورمنٹ پروگرامز میں تعلیم دیتے ہیں اور جنوبی افریقہ کے پریس میں اکثر لکھتے رہتے ہیں۔ وہ زمبابوے پیپرز کے کمشنر تھے، جو زمبابوے کے وزیر اعظم مورگن تسوانگیرائی(Morgan Tsvangirai) کو مگابے کی پالیسیوں کے بعد بحالی کے لئے پالیسی تجاویز کا ایک مجموعہ ہے۔ نولتشنگو اپنی جوانی میں جنوبی افریقہ کی بلیک کانشئس موومنٹ(Black Consciousness Movement) میں نمایاں تھے۔

جولائی 1794 میں، ایک انقلابی جمہوریہ، بنیاد پرست جمہوریت پسند، اور انقلابی فرانس میں دہشت گردی کے دور کے پیچھے کار فرما، جس کے دوران تقریباً 40,000 فرانسیسی مرد اور خواتین کو "قوم کے دشمن" کے طور پر گلوٹائن پر موت کے گھاٹ اتارا گیا، میکسیمیلیان

روبسپیر (Maximilien Robespierre)، اپنے سیاسی مخالفین کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اپنی موت سے چند لمحے قبل انہوں نے اس ہجوم سے مخاطب ہو کر کہا جو پہلے انہیں سراہتا تھا لیکن اب ان کے خون کا پیاسا تھا: "میں نے تمہیں آزادی دی؛ اب تمہیں روٹی بھی چاہیئے۔" اور اس کے ساتھ ہی دہشت کے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔

اس سے ہم جو اخلاقی سبق حاصل کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگرچہ سیاسی آزادی اور معاشی بہبود کے درمیان ایک تعلق ہو سکتا ہے لیکن وہ ایک ہی چیز نہیں ہیں۔

معاشی فلاح و بہبود آزادی کا نتیجہ ہے۔ جنوبی افریقہ میں جہاں باضابطہ طور پر ریکارڈ کی گئی بے روزگاری کی شرح 25.2 فیصد ہے (یہ اعداد و شمار ان لوگوں کو شامل نہیں کرتے جو کام کی تلاش چھوڑ چکے ہیں)، سیاسی آزادی اور اقتصادی بہبود کے درمیان فرق ایک ممکنہ تباہ کن حالت کو ظاہر کرتا ہے، ایک ایسا خطرہ جو متواتر سیاسی انتظامیہ کے اپنے حلقوں کو مختلف قسم کے فوائد کے وعدے کرنے سے مزید شدت اختیار کر لیتا ہے۔

ہمیں درپیش چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے، ہمیں بعض غلط فہمیوں کو دور کرنا ہو گا۔

ملازمتیں پیدا کرنا ریاست کا کردار نہیں ہے۔ پائیدار ملازمتوں کے لیے انہیں نجی شعبے کے ذریعہ پیدا کیا جانا چاہیئے۔ حکومت کی طرف سے پیدا کی گئی ملازمتیں ٹیکس دہندگان کی قیمت پر ہوتی ہیں اور ان کی مالی امداد والی ملازمتوں کے برابر ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ پائیدار نہیں ہوتی اس لئے ان کا کوئی مثبت اقتصادی نتیجہ نہیں ہوتا۔ نجی شعبہ دولت کا اہم تخلیق کار ہے، اور ریاستی شعبہ صارف ہے۔

پیسہ صرف اشیاء اور خدمات کے تبادلے کا ایک ذریعہ ہے اور اس لیے اسے پیداواریت سے منسلک ہونا چاہیئے اور اس کی عکاسی کرنی چاہیئے۔ جب میں 1991 میں کمیونزم کے بعد روس اور چیکوسلوواکیہ گیا، تو مذاق یہ تھا کہ کارکنوں نے کام کرنے کا دکھاوا کیا اور حکومت نے انہیں تنخواہ دینے کا دکھاوا کیا۔ لہذا، میری رائے میں جب ہم بامعنی ملازمتوں کی تخلیق پر بات کرتے ہیں تو ہمیں صرف نجی شعبے پر توجہ دینی چاہیئے۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نجی کاروباروں پر کون سی پالیسیاں لاگو ہونی چاہئیں؟ کون سی پالیسیاں ان کی پیداواریت میں اضافہ کریں گی اور کون سی ان کو پیچھے رکھیں گی؟ کیا کرنا چاہیئے؟

آیئے دو فریقین کے درمیان تبادلے کے سب سے سادہ اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ سادہ لین دین ایک بڑی معیشت کی مثال اور ایک چھوٹے نمونے کے طور پر کام کر سکتا ہے۔ انہیں پالیسی سازوں کو یہ بتانا چاہیئے کہ کون سی پالیسیاں انسانی فطرت کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہیں کیونکہ اقتصادی سیاق وسباق میں انسانی عنصر اہم ہے۔ ماضی کے ایک خیالی غار کے آدمی سے شروع کرتے ہیں جو شکار میں مہارت رکھتا ہے لیکن شکار کے لیے ہتھیار بنانے میں ماہر نہیں ہے۔ ہمارا غار کا آدمی ایک ماہر ہتھیار ساز سے ملتا ہے اور شکار کا کچھ حصہ ہتھیار کے عوض تبادلہ کرنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ دونوں آدمی اس لین دین سے اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ انہوں نے نفع حاصل کیا ہے، کیونکہ انہوں نے جو کچھ دیا ہے اس کے بدلے میں انہیں کچھ زیادہ قیمتی حاصل ہوا ہے۔ جلد یا بدیر، ہتھیار ساز دریافت کرتا ہے کہ اگر وہ ہتھیار بنانے میں مہارت حاصل کر لے تو شکار پر جانے کے بجائے وہ کھال، گوشت، ہاتھی دانت وغیرہ کے لیے ہتھیاروں کا سودا کر سکتا ہے۔ وہ کاروبار میں آجاتا ہے، وہ ترقی کرتا ہے اور اس

کے تمام گاہک خوشحال ہوتے ہیں کیونکہ وہ اب شکار کے زیادہ موثر ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔

اس منظر نامے کے بارے میں اہم بات یہ ہے کہ اس میں کوئی زبردستی یا دھوکہ دہی شامل نہیں ہے۔ کوئی تیسرا فریق شامل نہیں ہے۔ کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو کاروبار کرنے کے اصولوں کی وضاحت کرتی ہو۔ فریقین لین دین میں جن اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں وہ خود بخود وجود میں آتے ہیں۔ وہ ایسے مطابقت رکھتے ہیں جیسے کسی قدرتی ترتیب کے ساتھ ہوں۔ اسی کو آنجہانی ماہر معاشیات فریڈرک ہائیک نے "خود ساختہ ترتیب" کہاہے اور یہ اس ترتیب کا ایک حصہ یہ ہے کہ نجی جائیداد کا باہمی احترام کیا جائے۔

اس سادہ مثال سے، یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتاہے کہ جدید دور کی معیشت میں، ایک ایسے ملک میں جہاں حکومت اقتصادی میدان میں مداخلت سے باز رہے، وہاں تیز رفتار اقتصادی ترقی اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی و اقتصادی فوائد ہوں گے۔ دوسرے معنوں میں اگر حکومت پیداواریوں اور صارفین کی اقتصادی آزادی کو فروغ دیتی ہے اور انہیں ایسے لین دین میں شامل ہونے کی اجازت دیتی ہے جس میں جبر یا دھوکہ دہی شامل نہ ہو، تو ملک اور اس کے لوگ ترقی کریں گے۔ یہ بے روزگاری کو کم کرنے، تعلیم کو بہتر بنانے اور صحت کی بہتر دیکھ بھال فراہم کرنے کا یقینی طریقہ ہے۔

یہ بنیادی اصول تمام معیشتوں پر لاگو ہوتے ہیں، قطع نظر اس کے کہ ان کے تشکیل کے دوران ان کا ثقافتی تناظر کیا تھا۔ مستقل "کام کرنے کی اخلاقیات" کے افسانے پر تنقیدی توجہ دی جانی چاہیئے۔ یہ نقطہ نظر غیر محسوس طریقے سے قومی یا نسلی گروہوں کے بارے میں

دقیانوسی تصورات کو تقویت دیتا ہے، جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ غریب اس لیے غریب ہیں کیونکہ ان میں کام کرنے کی اخلاقیات کی کمی ہے اور امیر زیادہ کامیاب ہیں کیونکہ ان میں یہ اخلاقیات ہیں، خاص طور پر جب یہ نسل کے ساتھ موافق ہو تو یہ ایک بہت خطرناک نقطہ نظر ہے۔

1989 میں برلن کی دیوار کے گرنے سے قبل مغربی جرمنی دنیا کی دوسری بڑی معیشت تھی جبکہ مشرقی جرمنی ایک اقتصادی تباہی کا علاقہ تھا۔ یہ وہی لوگ تھے، وہی ثقافت تھی اور بعض صورتوں میں وہی خاندان تھے جنہیں دوسری جنگ عظیم کے بعد تقسیم کر دیا گیا تھا۔ دونوں کوریا کے بارے میں بھی اسی طرح کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے: جنوب ایک اقتصادی دیو اور شمال ایک اقتصادی گہرائی جو اب بھی غیر ملکی امداد جذب کرتا ہے۔ پھر بھی وہی لوگ اور وہی ثقافت۔ اور 1992 سے پہلے مین لینڈ چین اور ہانگ کانگ کے درمیان تضاد کیا تھا جب ڈینگ شیاؤپنگ (Deng Xiaoping) نے یہ اعلان کرتے ہوئے آزاد منڈی کی اصلاحات کا آغاز کیا کہ امیر ہونا شاندار ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بلی سفید ہے یا کالی جب تک کہ وہ چوہے پکڑتی ہے؟ پھر بھی وہی لوگ وہی ثقافت اور وہی نمایاں اقتصادی تضادات۔ فرق ہر بار اقتصادی اداکاروں کو دی گئی آزادی کی ڈگری کی وجہ سے پیدا ہوا۔

1992 کے بعد سے، حالیہ برسوں میں نظر آنے والی سب سے بڑی آزاد منڈی کی اصلاحات کی بدولت، چین اب دنیا کی تیسری بڑی معیشت کے طور پر ابھرا ہے۔ بدقسمتی سے اس کے برعکس، برٹیل شمت (Bertel Schmitt) کے الفاظ میں، "امریکہ نے وہ سوشلسٹ

اقتصادی کتابچہ اٹھایا جو ڈینگ شیاؤپنگ (Deng Xiaoping) نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھینک دیا تھا۔"

وہ قانون سازی اور ادارہ جاتی ڈھانچہ جس کے تحت اقتصادی سرگرمی ہوتی ہے اور خاص طور پر اس ضابطہ کی ڈگری جس پر ایک معیشت کا اطلاق ہوتا ہے، اس بات کا تعین کرتی ہے کہ ایک ملک اور اس کے باشندے کتنے امیر ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، حکومتیں افراد کو اقتصادی آزادی کا استعمال کس حد تک کرنے کی اجازت دیتی ہیں، اس کا تعین ان کے اقتصادی نتائج سے ہو گا۔

1986 میں پروفیسر والٹر ولیمز (Professor Walter Williams)، جو فکر انگیز کتاب "جنوبی افریقہ کی سرمایہ داری کے خلاف جنگ" (South Africa's War Against Capitalism) کے مصنف ہیں، نے ان تمام باتوں کا خلاصہ کیا: "۔۔۔ جنوبی افریقہ کے مسائل کا حل خصوصی پروگراموں میں نہیں ہے، یہ مثبت اقدام میں نہیں ہے، یہ امداد میں نہیں ہے، اور یہ فلاحی خدمات میں نہیں ہے۔ یہ آزادی میں ہے۔ کیونکہ اگر آپ دنیا بھر میں نظر ڈالیں اور امیر لوگوں، متنوع لوگوں کو دیکھیں جو اچھی طرح سے مل جل سکتے ہیں، تو آپ بھی ایک ایسے معاشرے کو دیکھ رہے ہیں جہاں نسبتاً بڑی مقدار میں فرد کی آزادی موجود ہے۔"

باب نمبر 4
عالمی سرمایہ کاری

عالمی سرمایہ داری اور انصاف

تحریر: جون ارنگا
(June Arunga)

اس مضمون میں جون ارنگا افریقہ میں آزاد منڈی کی سرمایہ داری کی حمایت کرتی ہیں اور ان لوگوں کا سامنا کرتی ہیں جو افریقیوں کو تجارت کی آزادی کے ذریعے عالمی معیشت میں شامل ہونے سے روکنے کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ آزاد تجارت کے حق میں ہے، کیونکہ وہ ان لوگوں پر تنقید کرتی ہیں جو غیر ملکی سرمایہ کاروں یا مراعات یافتہ مقامی اشرافیہ کو خصوصی مراعات (اور کبھی کبھی مقامی لوگوں کے جائیداد کے حقوق کی خلاف ورزی) فراہم کرنے والے مخصوص "تجارتی زون" کی حمایت کرتے ہیں اور دوسروں کو برابر بنیاد پر تجارت یا سرمایہ کاری کی آزادی سے محروم کرتے ہیں۔ وہ افریقی عوام کے جائیداد کے حقوق کا احترام کرنے اور آزاد منڈی کی سرمایہ داری کا مطالبہ کرتی ہیں جو مراعات اور اجارہ داری طاقتوں کی مداخلت سے ہو۔

جون ارنگا کینیا کی ایک کاروباری خاتون اور فلم پروڈیوسر ہیں۔ وہ اوپن کویسٹ میڈیا ایل ایل سی (Open Quest Media LLC) کی بانی اور سی ای او ہیں اور افریقہ میں کئی ٹیلی کام منصوبوں کے ساتھ کام کر چکی ہیں۔ انہوں نے افریقہ کے بارے میں دو بی بی سی دستاویزی فلمیں بنائی ہیں، "دی ڈیولز فٹ پاتھ (The Devil's Footpath)"، جو قاہرہ سے کیپ ٹاؤن تک چھ ہفتوں کے دوران 5,000 میل کے سفر کو دستاویزی شکل دیتی ہے، اور "وہو از ٹو بلیم؟ (Who's to blame?)"، جو ارنگا اور گھانا کے سابق صدر جیری رالنگز (Jerry Rawlings) کے درمیان بحث / مکالمے پر مبنی ہے۔ وہ AfricanLiberty.org کے

لیے لکھتی ہیں اور کینیا میں موبائل فون انقلاب (The Cell Phone Revolution in Kenya) کی شریک مصنف ہیں۔ ارنگا نے برطانیہ کی یونیورسٹی آف بکنگھم (University of Buckingham) سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔

میرا تجربہ یہ ہے کہ زیادہ تر اختلافات، شاید 90 فیصد، ایک طرف یا دوسری طرف اطلاعات کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر اہم ہے جب لوگ ایک ثقافتی جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں۔ ہم افریقہ میں، افریقیوں کے درمیان ایک طویل عرصے کی تحفظ پسندی، قوم پرستی اور غلط فہمی کے بعد تجارت میں ایک بڑی تیزی دیکھ رہے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں تجارت کے بڑھنے کا جشن منانا چاہیئے۔ کچھ لوگ تجارت میں اضافے سے خوفزدہ ہیں؛ مجھے لگتا ہے کہ انہیں مزید معلومات کی ضرورت ہے۔

گلوبلائزیشن ہو رہی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اس نے مہارتوں کی منتقلی، دنیا بھر سے ٹیکنالوجی تک رسائی اور بہت کچھ پیدا کیا ہے۔ تاہم، بہت سے لوگوں کو باہر رکھا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں؟ میں نے 2002 میں سویڈش ماہر اقتصادیات جوہان نوبرگ (Johan Norberg)، جو ایک آنکھیں کھول دینے والی کتاب "ان ڈیفنس آف گلوبل کیپیٹلزم (In Defense of Global Capitalism)" کے مصنف ہیں، سے ملاقات کی اور میں نے حیران رہ گئی کہ وہ معلومات سے کیسے نمٹتے ہیں۔ انہوں نے صرف آزاد تجارت کے مخالفین کو مسترد نہیں کیا۔ بلکہ، انہوں نے ان کی بات سنی، ان کے نقطہ نظر پر غور کیا اور ان کی معلومات کی تصدیق کی۔ ان کی حقائق پر مبنی معلومات میں دلچسپی ہی تھی جس کی وجہ سے وہ سرمایہ داری کے حامی بنے۔

مجھے اس بات نے بھی متاثر کیا کہ نوبرگ نے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے لوگوں یعنی غریبوں کے نقطہ نظر کو کیسے لیا۔ نوربرگ نے دنیا کا سفر کیا اور سوالات پوچھے۔ وہ لوگوں کو یہ نہیں بتاتے کہ انہیں کیا سوچنا چاہیئے۔ وہ ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا سوچتے ہیں۔ انہوں نے ان غریب لوگوں سے سوالات پوچھے جنہیں تجارت میں شامل ہونے کے مواقع فراہم کیے گئے تھے، چاہے وہ تاجر یا بیوپاری کے طور پر ہوں یا بین الاقوامی تجارت میں شامل کاروباروں کے ملازمین کے طور پر، انہوں نے ان حقائق کو ظاہر کیا جو سرکاری تبصرہ نگاروں نے نظر انداز کر دیئے تھے۔ کیا اس نئی فیکٹری میں ملازمت نے آپ کی زندگی بہتر کی یا بدتر؟ کیا آپ کے پہلے موبائل فون نے آپ کی زندگی کو بہتر کیا یا بدتر؟ کیا آپ کی آمدنی بڑھی ہے یا کم ہوئی ہے؟ آپ کیسے سفر کرتے ہیں: پیدل، سائیکل پر، موٹر سائیکل پر، یا کار میں؟ کیا آپ موٹر سائیکل پر سوار ہونا پسند کرتے ہیں یا پیدل چلنا؟ نوبرگ زمینی حقائق کو دیکھنے پر زور دیتے ہیں۔ وہ شامل لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا سوچتے ہیں اور آیا آزاد تجارت نے ان کی زندگیوں کو بہتر بنایا ہے یا نہیں۔ وہ انفرادی نقطہ نظر سننا چاہتے ہیں۔

ہمیں یہ پوچھنا چاہیے کہ ہماری حکومتیں ہمارے ساتھ کیا کر رہی ہیں، نہ کہ صرف ہمارے لیے کیا کر رہی ہیں۔ ہماری حکومتیں ہمیں نقصان پہنچا رہی ہیں: وہ ہم سے چوری کرتی ہیں، ہمیں تجارت سے روکتی ہیں، اور غریبوں کو نیچے رکھتی ہیں۔ مقامی سرمایہ کاروں کو کم آمدنی والے ممالک میں قانون کی حکمرانی کی کمی کی وجہ سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ عوام کو ان کی حکومتیں احترام نہیں دیتیں شاید اسی لیے وہ کم آمدنی والے ممالک ہیں۔

غریب ممالک کی بہت سی حکومتیں "غیر ملکی سرمایہ کاروں" کو راغب کرنے پر توجہ مرکوز کرتی ہیں، لیکن وہ اپنے لوگوں کو بازار میں داخل ہونے نہیں دیتیں۔ مقامی لوگوں کے لیے

مارکیٹ اور مسابقت کو کھولنا ان کے ایجنڈے پر نہیں ہے۔ مقامی لوگوں کے پاس بصیرت، سمجھ بوجھ اور "مقامی علم" ہوتا ہے۔ لیکن افریقہ میں ہماری حکومتیں غیر ملکی یا مقامی خصوصی مفاد گروپوں کے حق میں اپنے لوگوں کو مارکیٹ سے باہر رکھتی ہیں۔

مثال کے طور پر، بھاری پابندیاں جو بینکنگ اور پانی کی فراہمی جیسی خدمات میں مقامی مسابقت کو روکتی ہیں، ہمارے لوگوں کی ٹیکنالوجی، ترجیحات اور بنیادی ڈھانچے کے بارے میں اپنے مقامی علم کو استعمال کرنے کی صلاحیتوں کو نظر انداز کرتی ہے۔ یہ "عالمگیریت" (گلوبلائزیشن) نہیں ہے کہ "غیر ملکی سرمایہ کاروں" کو خصوصی رعایت دی جائے جبکہ مقامی لوگوں کو باہر نکال دیا جائے اور انہیں مقابلہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اگر وہ "خصوصی اقتصادی زونز" جو حکومتیں "غیر ملکی سرمایہ کاروں" کو راغب کرنے کے لیے بناتی ہیں، ایک اچھا خیال ہیں، تو ہمارے زیادہ تر لوگ ان سے فائدہ کیوں نہیں اٹھا سکتے؟ انہیں مراعات یافتہ زونز کیوں سمجھا جاتا ہے بجائے اس کے کہ یہ ہر ایک کے لیے تجارت کی آزادی کا حصہ ہوں؟ تجارت کی آزادی کا مقصد لوگوں کی خدمت کے لیے آزادانہ مسابقت ہونا چاہیئے، نہ کہ مقامی اشرافیہ کے لیے خصوصی مراعات جو مسابقت نہیں چاہتے، یا غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے جو وزراء کے ساتھ خصوصی ملاقاتیں کرتے ہیں۔

یہ "آزاد تجارت" نہیں ہے جب بین الاقوامی کمپنیاں حکومتوں سے خصوصی رعایتیں حاصل کر سکتی ہیں اور یہ "آزاد تجارت" نہیں ہے جب مقامی کمپنیاں اپنی حکومت کے ذریعے بازار سے باہر رکھی جاتی ہیں۔ آزاد تجارت کا مطلب ہے کہ سب کے لیے قانون کی حکمرانی ہو اور سب کو سب سے فطری عمل میں شامل ہونے کی آزادی ہو: رضاکارانہ تبادلہ۔

ہماری خوشحالی بطور افریقی غیر ملکی امداد یا آسان پیسوں سے نہیں آئے گی۔ ہمیں افریقہ میں اس قسم کی امداد بہت ملی ہے لیکن اس نے غریبوں کی زندگیوں پر مثبت اثر نہیں ڈالا۔ اس قسم کی "امداد" بد عنوانی کو جنم دیتی ہے اور قانون کی حکمرانی کو کمزور کرتی ہے۔ یہ امداد بھیجنے والے ممالک میں مخصوص لوگوں سے خدمات کی خریداری سے منسلک ہے۔ یہ تجارتی تعلقات کو بگاڑ دیتی ہے۔ لیکن سب سے بری بات یہ ہے کہ "امداد" حکومتوں کا اپنے لوگوں سے رابطہ منقطع کر دیتی ہے، کیونکہ جو لوگ بل ادا کر رہے ہیں وہ افریقہ میں نہیں ہیں، بلکہ پیرس، واشنگٹن یا برسلز میں ہیں۔

مقامی اشرافیہ جو آپ جانتے ہیں کیسے، وزیر کے کان تک رسائی حاصل کر لیتی ہے، تجارت کو بگاڑ سکتی ہے اور غیر آزاد بنا سکتی ہے۔ تجارت کو اجارہ داری کے حقوق دینے کے ذریعے بگاڑ دیا جاتا ہے جو مقامی اور غیر ملکی دونوں مد مقابل کو باہر رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ جب غیر ملکی اشرافیہ اپنے حکومتوں کے ساتھ ملی بھگت سے مقامی حکومتوں سے منسلک امدادی معاہدوں کے ذریعے اجارہ داری کے حقوق حاصل کرتی ہیں تو تجارت کو بگاڑ دیا جاتا ہے اور غیر آزاد بنایا جاتا ہے: وہ معاہدے جو مقامی اور غیر ملکی دونوں مد مقابل کو باہر رکھتے ہیں کیونکہ معاہدہ طے شدہ ہے۔ ان سب قوانین کی وجہ سے ہمارے بازار اور ہماری آزادی محدود ہو جاتی ہے۔ ہمیں وہ سامان اور خدمات خریدنی پڑتی ہیں جو شاید نہ تو اعلیٰ معیار کی ہوں اور نہ ہی بہترین قیمت پر ہوں کیونکہ ہمارے پاس انتخاب کی آزادی نہیں ہوتی۔ اس آزادی کی کمی ہمیں نیچے رکھتی ہے اور غربت کو جاری رکھتی ہے۔

لیکن ہم صرف کم قیمتوں اور بہتر معیار سے محروم نہیں ہوتے۔ ہمیں جدت طرازی کرنے، اپنی عقل کا استعمال کرنے اور اپنی توانائی اور عقل سے اپنی صورتحال کو بہتر بنانے کے مواقع

سے محروم رکھا جاتا ہے۔ طویل مدت میں، یہ ہمارے خلاف سب بڑا جرم ہے۔ تحفظ پسندی اور مراعات نہ صرف اقتصادی دیوالیہ پن کو جاری رکھتی ہیں، بلکہ ذہنی جمود، ہمت، کردار، ارادہ، خود پر اعتماد اور ایمان کو بھی کمزور کرتی ہیں۔

ہمیں معلومات کی ضرورت ہے۔ ہمیں زمینی سطح پر لوگوں سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں وہی حقائق جانچنے کرنے کی ضرورت ہے۔ زیادہ تر صورتوں میں یہ پوشیدہ نہیں ہوتے، لیکن چند لوگ ہی انہیں دیکھنے کی زحمت کرتے ہیں۔ یہ ثبوت ہے کہ آزاد منڈی کی سرمایہ داری، آزاد تجارت، اور قانون کی حکمرانی کے تحت برابر کے حقوق عوام کی خوشحالی کے لیے سازگار ہیں۔

ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ آزاد منڈی کی سرمایہ داری ہے جو ہمارے لیے اپنی صلاحیتوں کا ادراک کرنے کی جگہ پیدا کرے۔ پیرو کے ماہر معاشیات ہرنیڈو ڈی سوٹو(Hernando de Soto)نے اپنی کتاب "The Mystery of Capital"میں دکھایا ہے کہ کس طرح غریب لوگ "مردہ سرمایہ" کو "زندہ سرمایہ" میں تبدیل کرکے اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ سرمایہ کی کمی ناگزیر نہیں ہے۔ ہمارے پاس افریقہ میں اتنا زیادہ سرمایہ ہے لیکن اس کا زیادہ تر حصہ ہماری زندگی کو بہتر بنانے کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ "مردہ" ہے۔ ہمیں اپنی املاک کے حقوق کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا وافر سرمایہ "زندہ سرمایہ" بن جائے جو زندگی پیدا کرتا ہے۔ ہمیں جائیداد کی ضرورت ہے، یعنی ہمیں اپنے حقوق کا احترام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں قانون کے سامنے مساوات کی ضرورت ہے۔ ہمیں آزاد منڈی کی سرمایہ داری کی ضرورت ہے۔

گلوبلائزیشن کے ذریعے انسانی بہتری

ورنن سمتھ
(Vernon Smith)

اس مضمون میں، ماہر اقتصادیات اور نوبل انعام یافتہ ورنن سمتھ مارکیٹوں کے پھیلاؤ کے ذریعے انسانی دولت میں اضافے کا تذکرہ کرتے ہیں اور وضاحت کرتے ہیں کہ کس طرح عالمی سرمایہ داری انسانی بہتری پیدا کرتی ہے۔

ورنن سمتھ کیلیفورنیا کی چپ مین یونیورسٹی (Chapman University) میں معاشیات کے پروفیسر ہیں اور "تجرباتی اقتصادیات" کے ابھرتے ہوئے شعبے میں پیش رو ہیں۔ ان کی تحقیق اجناس اور سرمایہ مارکیٹوں، اثاثوں کے بلبوں کے ابھار، کاروباری چکروں، مالیات، قدرتی وسائل کی معاشیات، اور مارکیٹ اداروں کی نشوونما پر مرکوز رہی ہے۔ 2002 میں انہوں نے " تجرباتی معاشی تجزیہ، خاص طور پر متبادل مارکیٹ میکانزم کے مطالعہ میں ایک آلہ کے طور پر تجربہ گاہوں کے تجربات کو قائم کرنے" کے لیے مشترکہ نوبل انعام برائے معاشیات جیتا۔ انہوں نے اقتصادیات، گیم تھیوری، اور خطرے کے موضوع پر تعلیمی جریدوں میں بڑے پیمانے پر مضامین شائع کئے اور " Papers in Experimental Economics and Bargaining and Market Behavior: Essays in Experimental Economics" کے مصنف ہیں۔ سمتھ ایک مشہور استاد بھی ہیں اور انہوں نے تجرباتی اقتصادیات کے پروگرامز تیار کیے ہیں جو نہ صرف اقتصادی عمل میں نئی بصیرت پیدا کرنے کے لیے ہیں بلکہ اقتصادی اصولوں کی تعلیم دینے کے لیے بھی ہیں۔

یہ مضمون "Evenings at FEE42" میں ستمبر 2005 میں دی گئی ایک تقریر سے لیا گیا

ہے۔

میرا آج کا پیغام ایک پر امید پیغام ہے۔ یہ تبادلے اور بازاروں کے بارے میں ہے جو ہمیں کام اور علم کی خصوصیت میں مشغول ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ یہی خصوصیت تمام دولت کے حصول کا راز ہے اور پائیدار انسانی بہتری کا واحد ذریعہ ہے۔ یہی گلوبلائزیشن کی اصل روح ہے۔

چیلنج یہ ہے کہ ہم سب بیک وقت دو متداخل (اوورلیپنگ) تبادلہ کی دنیامیں کام کرتے ہیں۔ سب سے پہلے، ہم ایک ذاتی اور سماجی تبادلے کی دنیا میں رہتے ہیں جو چھوٹے گروپوں، خاندانوں اور کمیونٹیوں میں باہمی تعاون اور مشترکہ اصولوں پر مبنی ہے۔ "آئی او یو ون" (میں آپ کا مقروض ہوں) کا جملہ بہت سی زبانوں میں انسانی عالمی اصول ہے جس میں لوگ کسی احسان کے لئے اپنے قرض کو رضاکارانہ طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ ابتدائی اوقات سے ہی ذاتی تبادلے نے کام کی تقسیم (شکار، اکٹھا کرنا اور اوزار بنانا) کی اجازت دی اور بہتر پیداواریت اور فلاح و بہبود کی بنیاد رکھی۔ اس کام کی تقسیم نے ابتدائی انسانوں کے لیے دنیا بھر میں نقل مکانی ممکن بنادی۔ اس طرح، خصوصیت (اسپیشلائزیشن) نے رسمی منڈیوں کے ظہور سے بہت پہلے عالمگیریت (گلوبلائزیشن) کا آغاز کر دیا۔

دوسرا، ہم غیر ذاتی مارکیٹ تبادلے کی دنیامیں رہتے ہیں جہاں بات چیت اور تعاون آہستہ آہستہ اجنبیوں کے درمیان طویل فاصلے کی تجارت کے ذریعے ترقی کرتی ہے۔ ذاتی تبادلے کے عمل میں ہم عام طور پر دوسروں کے لئے بھلائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تاہم، مارکیٹ میں یہ تصور اکثر کھو جاتا ہے کیونکہ ہم میں سے ہر ایک اپنے فائدے پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ تاہم،

ہمارے کنٹرول لیباریٹری تجربات ظاہر کرتے ہیں کہ وہی افراد جو ذاتی تبادلے میں تعاون کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں، بڑے بازار میں اپنے فائدے کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بغیر کسی ارادے کے، اپنی مارکیٹ کی لین دین میں وہ بھی گروپ کو ملنے والے مشترکہ فائدے کو زیادہ سے زیادہ کرتے ہیں۔ کیوں؟ ملکیت کے حقوق کی وجہ سے۔ ذاتی تبادلے میں حکمرانی کے اصول فریقوں کی رضاکارانہ رضامندی سے ابھرتے ہیں۔ غیر ذاتی مارکیٹ تبادلے میں حکمرانی کے اصول، جیسے کہ ملکیت کے حقوق جو بغیر معاوضہ لینے سے روکتے ہیں، ادارہ جاتی فریم ورک میں شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح دونوں دنیا کے تبادلے ایک ہی طرح سے کام کرتے ہیں: آپ کو وصول کرنے کے لئے دینا پڑتا ہے۔

خوشحالی کی بنیاد

اجناس اور خدمات کی منڈیاں جو دولت کی تخلیق کی بنیاد ہیں، خصوصیت کی حد کا تعین کرتی ہیں۔ منظم منڈیوں میں، پروڈیوسر (پیداوار کرنے والے) پیداوار کی نسبتاً متوقع لاگت کا تجربہ کرتے ہیں اور صارفین قیمتی اشیا کی نسبتاً متوقع فراہمی پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ مستقل دوہرائے جانے والے بازار کی سرگرمیاں، یہاں تک کہ بہت پیچیدہ بازار کے تعلقات میں بھی جہاں ایک سے زیادہ اجناس کا تبادلہ ہوتا ہے، ناقابل یقین حد تک موثر ہوتی ہیں۔

ہم نے اپنے بازار کے تجربات کے ذریعے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ لوگ عام طور پر اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ کسی بھی قسم کا ماڈل ان کی آخری تجارتی قیمتوں اور ان کی خرید و فروخت کے سامان کے حجم کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ درحقیقت مارکیٹ کی کارکردگی کے لیے

شرکاء کی بڑی تعداد، مکمل معلومات، اقتصادی فہم یا کسی خاص شائستگی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ لوگ مارکیٹ کے عمل کا مطالعہ کرنے کے لیے کسی ماہر معاشیات موجود ہونے سے بہت پہلے مارکیٹوں میں تجارت کر رہے تھے۔ آپ کو صرف یہ جاننا ہوتا ہے کہ آپ زیادہ پیسہ بنا رہے ہیں یا کم پیسہ اور کیا آپ کے پاس اپنے اقدامات کو تبدیل کرنے کا موقع ہے۔

اجناس اور خدمات کی منڈیوں کا نشان تنوع ہے - ذائقوں، انسانی مہارتوں، علم، قدرتی وسائل، مٹی اور آب و ہوا کا تنوع۔ لیکن تبادلے کی آزادی کے بغیر تنوع غربت کو جنم دیتا ہے۔ کوئی بھی انسان، چاہے وہ کسی ایک مہارت یا ایک ہی وسائل سے مالا مال ہو، تجارت کے بغیر خوشحال نہیں ہو سکتا۔ آزاد منڈیوں کے ذریعے ہم دوسروں پر انحصار کرتے ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے، پہچانتے اور نہ ہی سمجھتے ہیں۔ بازاروں کے بغیر ہم واقعی غریب، دکھی، جنگلی اور جاہل ہوتے۔

بازاروں کو معاشرتی تعامل اور اقتصادی تبادلے کے قواعد کی باہمی رضامندی پر مبنی نفاذ کی ضرورت ہوتی ہے۔ 250 سال قبل ڈیوڈ ہیوم (David Hume) سے بہتر کسی نے نہیں کہا کہ؛ فطرت کے صرف تین قوانین ہیں: ملکیت کا حق، رضامندی سے منتقلی، اور وعدوں کی تکمیل۔ یہ وہ حتمی بنیادیں ہیں جو بازاروں اور خوشحالی کو ممکن بناتی ہیں۔

ہیوم کے فطرت کے قوانین قدیم احکام سے اخذ ہیں: "چوری نہ کرنا، اپنے پڑوسی کی جائیداد کی لالچ نہ کرنا، اور جھوٹی گواہی نہ دینا"۔ چوری کا کھیل دولت کو خرچ کرتا ہے اور اس کی دوبارہ پیداوار کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ دوسروں کی جائیداد کی خواہش کرنا ایک جبر والی ریاست کو دولت کو دوبارہ تقسیم کرنے کی دعوت دیتا ہے، اس طرح کل کی فصل پیدا کرنے

کی ترغیب کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ جھوٹی گواہی دینا کمیونٹی، انتظامیہ کی ساکھ، سرمایہ کار کے اعتماد، طویل مدتی منافع، اور ذاتی تبادلے کو نقصان پہنچاتا ہے جو سب سے زیادہ انسانی ہیں۔

صرف منڈیاں ہی سامان فراہم کرتی ہیں

اقتصادی ترقی آزاد اقتصادی اور سیاسی نظاموں کے ساتھ منسلک ہے جو قانون کی حکمرانی اور نجی ملکیت کے حقوق سے تقویت حاصل کرتی ہیں۔ مضبوط مرکزی منصوبہ بندی والے نظام جہاں بھی آزمائے گئے، سامان فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تاہم، چین سے نیوزی لینڈ اور آئرلینڈ تک بڑے اور چھوٹے ممالک کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں حکومتوں نے اقتصادی آزادی کی راہ میں کچھ رکاوٹیں کم کر دی ہیں۔ ان ممالک نے محض لوگوں کو اپنے اقتصادی فائدے کے حصول کی اجازت دے کر غیر معمولی اقتصادی ترقی دیکھی ہے۔

چین نے اقتصادی آزادی کی سمت میں نمایاں پیش رفت کی ہے۔ صرف ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ پہلے، چین نے اپنے آئین میں ترمیم کی تاکہ لوگوں کو نجی ملکیت رکھنے، خریدنے اور فروخت کرنے کی اجازت دی جائے۔ کیوں؟ چینی حکومت کو درپیش ایک مسئلہ یہ تھا کہ لوگ جائیداد خرید اور فروخت کر رہے تھے حالانکہ یہ لین دین حکومت کے ذریعہ تسلیم نہیں کئے جاتے تھے۔ اس سے مقامی حکام کو ان لوگوں سے وصولی کا موقع ملا جو قانون کو توڑ کر تجارت کر رہے تھے۔ املاک کے حقوق کو تسلیم کر کے مرکزی حکومت مقامی افسر شاہی کی بدعنوانی کی حمایت کرنے والے طاقت کے ذرائع کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے، جس کی مرکزی طور پر نگرانی اور کنٹرول کرنا بہت مشکل ہے۔ جیسا کہ میں دیکھتا ہوں، یہ آئینی

تبدیلی حکومت کی بے لگام بدعنوانی اور اقتصادی ترقی میں سیاسی مداخلت کو محدود کرنے کا ایک عملی ذریعہ ہے۔

اگرچہ یہ تبدیلی آزادی کے لیے کسی سیاسی تعصب کی وجہ سے نہیں ہوئی، لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ یہ ایک آزاد معاشرے کی طرف جانے کا راستہ ہموار کرے۔ فوری فوائد پہلے ہی موجود ہیں: 500 میں سے 276 خوشحال کمپنیاں اس وقت بیجنگ کے قریب ایک بڑے R&D پارک میں سرمایہ کاری کر رہی ہیں، جو کہ چینی حکومت کی طرف سے انتہائی سازگار 50 سالہ لیز کی شرائط پر مبنی ہے۔

آئرلینڈ کا کیس اس اصول کو ظاہر کرتا ہے کہ دولت مند بننے کے لیے آپ کا بڑا ملک ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ حکومت کی اقتصادی پالیسی کو آزاد کر کے بھی ایسا ممکن ہے۔ ماضی میں، آئرلینڈ لوگوں کا ایک بڑا برآمد کنندہ تھا۔ اس سے امریکہ اور برطانیہ کو فائدہ پہنچا، جنہوں نے اپنے آبائی ملک کی دلدلی زندگی سے فرار ہونے والے کئی ذہین آئرش تارکین وطن کو خوش آمدید کہا۔ صرف دو دہائیاں قبل آئرلینڈ تیسری دنیا کی غربت میں مبتلا تھا، لیکن اب اس نے فی کس آمدنی میں اپنے سابق نوآبادیاتی مالک کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور ایک پرعزم یورپی کھلاڑی بن گیا ہے۔ ورلڈ بینک کے اعداد و شمار کے مطابق، آئرلینڈ کی مجموعی گھریلو پیداوار (GDP) کی شرح نمو 1980 کی دہائی میں 3.2 فیصد سے بڑھ کر 1990 کی دہائی میں 7.8 فیصد ہو گئی۔ حال ہی میں، آئرلینڈ فی کس جی ڈی پی میں دنیا میں آٹھویں نمبر جب کہ برطانیہ پندرھویں نمبر پر تھا۔ براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری (بشمول وینچر کیپیٹل) کو فروغ دے

کر اور مالیاتی خدمات اور معلوماتی ٹیکنالوجی کو فروغ دے کر، آئرلینڈ نے دماغی قوت کی نمایاں واپسی (برین ڈرین ریورسل) کا تجربہ کیا ہے، اب نوجوان لوگ واپس اپنے وطن آرہے ہیں۔

یہ نوجوان لوگ واپس آرہے ہیں کیونکہ ان کے آبائی وطن میں اقتصادی آزادی کے پھیلاؤ کی وجہ سے نئے مواقع ممکن ہوئے ہیں۔ وہ "کر سکتے" (can-do) علم پر مبنی کاروباری افراد کی مثالیں ہیں جو نہ صرف اپنے آبائی ملک کے لیے بلکہ امریکہ اور دنیا کے تمام ممالک کے لیے دولت اور انسانی بھلائی پیدا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی کہانیاں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ کس طرح بری سرکاری پالیسیوں کو تبدیل کیا جاسکتا ہے تاکہ نئے اقتصادی مواقع پیدا کیے جاسکیں جو ڈرامائی طور پر کسی ملک کی برین ڈرین کو تبدیل کر سکتے ہیں۔

ہمیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں

تبدیلی، ترقی، اور اقتصادی بہتری کے عمل کا ایک اہم حصہ یہ ہے کہ گزشتہ کل کی ملازمتوں کو گزشتہ کل کی ٹیکنالوجی کے راستے پر چلنے کی اجازت دی جائے۔ ملکی کمپنیوں کو آؤٹ سورسنگ سے روکنے سے ان کے غیر ملکی حریفوں کو ایسا کرنے سے نہیں روکا جاسکے گا۔ آؤٹ سورسنگ کے ذریعے، غیر ملکی حریف اپنی لاگت کو کم کرنے، بچت کا استعمال قیمتوں کو کم کرنے اور ٹیکنالوجی کو اپ گریڈ کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور اس طرح مارکیٹ میں ایک بڑا فائدہ حاصل کریں گے۔

آؤٹ سورسنگ کی سب سے معروف مثالوں میں سے ایک دوسری جنگ عظیم کے بعد نیو انگلینڈ کی ٹیکسٹائل صنعت کا کم اجرتوں کے رد عمل میں جنوبی ریاستوں میں منتقل ہونا تھا۔

(جیسا کہ توقع کی جا رہی تھی، اس سے جنوب میں اجرتیں بڑھ گئیں اور صنعت کو آخر کار ایشیا میں کم لاگت والے ذرائع کی طرف بڑھنا پڑا۔)

لیکن نیو انگلینڈ میں ملازمتیں ختم نہیں ہوئیں، ٹیکسٹائل کے کاروبار کی جگہ ہائی ٹیک صنعتوں جیسے الیکٹرانک انفارمیشن اور بایو ٹیکنالوجی نے لے لی۔ اس کے نتیجے میں نیو انگلینڈ کے لیے بڑے خالص فوائد ہوئے حالانکہ اس نے ایک بار اہم صنعت کھو دی تھی۔ 1965 میں وارن بفٹ(Warren Buffett) نے برکشائر ہیتھ وے (Berkshire Hathaway) کا کنٹرول حاصل کر لیا، جو کہ میساچوسٹس(Massachusetts) کے ان زوال پذیر ٹیکسٹائل مینوفیکچررز میں سے ایک تھا۔ اس نے کمپنی کے بڑے لیکن گرتے ہوئے نقد بہاؤ کو استعمال کیا تاکہ کم قیمت کاروباری منصوبوں میں دوبارہ سرمایہ کاری کی جا سکے۔ وہ شاندار طور پر کامیاب ہو گئے اور 40 سال بعد بفٹ کی کمپنی کی مارکیٹ کیپٹلائزیشن 113 بلین ڈالر ہے۔ یہی تبدیلی آج کل K-Mart اور Sears Roebuck کے ساتھ ہو رہی ہے۔ کچھ بھی ہمیشہ کے لیے نہیں ہے: جیسے جیسے پرانے کاروبار زوال پذیر ہوتے ہیں، ان کے وسائل نئے کاروباروں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

نیشنل بیورو آف اکنامک ریسرچ نے ابھی امریکی ملٹی نیشنل کارپوریشنز کی طرف سے ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کاری کا ایک نیا مطالعہ رپورٹ کیا ہے۔ مطالعے نے یہ ظاہر کیا ہے کہ کسی غیر ملکی ملک میں ہر ڈالر کی سرمایہ کاری کے لیے وہ امریکہ میں ساڑھے تین ڈالر کی سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر ملکی اور ملکی سرمایہ کاری کے درمیان ایک تکمیلی تعلق ہے: جب ایک میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسرا بھی بڑھتا ہے۔ میکنزی اینڈ کمپنی

(McKinsey and Company) کا اندازہ ہے کہ ہر ڈالر کے لیے جو امریکی کمپنیاں بھارت کو آؤٹ سورس کرتی ہیں، 1.14 ڈالرز امریکہ کے فائدے میں آتے ہیں۔ اس فائدے کا تقریباً نصف سرمایہ کاروں اور صارفین کو واپس کیا جاتا ہے اور باقی زیادہ تر نئی ملازمتوں پر خرچ ہوتا ہے جو پیدا کی گئی ہیں۔ اس کے برعکس، جرمنی میں، بیرون ملک سرمایہ کاری کرنے والا ہر یورو ملکی معیشت کو صرف 80 فیصد فائدہ دیتا ہے، بنیادی طور پر اس وجہ سے کہ بے گھر جرمن کارکنوں کی دوبارہ ملازمت کی شرح حکومتی ضوابط کی ایک بڑی تعداد کی وجہ سے بہت کم ہے۔

میرا ماننا ہے کہ جب تک امریکہ دنیا کے انوویشن انڈیکس میں نمبر ون ہے، ہمیں آؤٹ سورسنگ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور ہمیں خوف زدہ ہونا چاہیئے اگر ہمارے سیاست دان اس کی مخالفت میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ فار انٹر نیشنل اکنامکس کے مطابق 1999-2003 میں کمپیوٹر سافٹ ویئر کی ایک لاکھ 50 ہزار سے زیادہ ملازمتیں پیدا ہوئیں، جب کہ آؤٹ سورسنگ کی وجہ سے 70 ہزار ملازمتیں ختم ہو گئیں۔ اسی طرح سروس سیکٹر میں دس لاکھ پرانی ملازمتوں کی جگہ لینے کے دوران بارہ لاکھ نئی ملازمتیں پیدا ہوئیں۔ تیز رفتار تکنیکی تبدیلی اور پرانی ملازمتوں کو نئی ملازمتوں کے ساتھ تبدیل کرنے کا یہ رجحان ہی معاشی ترقی ہے۔

غیر ملکی ممالک کو آؤٹ سورس کرنے سے، امریکی کاروبار پیسے بچاتے ہیں جس سے انہیں نئی ٹیکنالوجیز اور نئی ملازمتوں میں سرمایہ کاری کرنے کی اجازت ملتی ہے تاکہ عالمی مارکیٹ میں مقابلے میں رہ سکیں۔ بدقسمتی سے ہم منتقلی کے درد کو برداشت کیے بغیر فوائد سے لطف اندوز

نہیں ہو سکتے۔ تبدیلی یقینی طور پر تکلیف دہ ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے تکلیف دہ ہے جو اپنی ملازمتیں کھو دیتے ہیں اور انہیں نئے کیریئر کی تلاش کرنی ہوتی ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے تکلیف دہ ہے جو نئی ٹیکنالوجیز میں سرمایہ کاری کا خطرہ مول لیتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ لیکن، جیتنے والوں کے ذریعے حاصل کردہ فوائد پوری معیشت کے لیے زبردست نئی دولت پیدا کرتے ہیں۔ یہ فوائد، بدلے میں مارکیٹ کے ذریعے دریافت کرنے کے عمل اور مسابقت سیکھنے کے تجربے کے ذریعے مضبوط کیے جاتے ہیں۔

گلوبلائزیشن کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ ایک قدیم انسانی تحریک کی وضاحت کرنے والا ایک جدید لفظ ہے، انسانیت کے تبادلے اور مہارت کی دنیا بھر میں توسیع کے ذریعے بہتری کی تلاش کا ایک لفظ ہے۔ یہ ایک پرامن لفظ ہے۔ عظیم فرانسیسی ماہر اقتصادیات فریڈرک باسٹیئٹ (Frederic Bastiat) کے دانشمندانہ قول کے مطابق "اگر سرحدوں کو سامان عبور نہیں کرتے تو فوجی کریں گے"۔

آزادی کی ثقافت

تحریر: ماریو ورگاس لوسا (Mario Vargas Llosa)

اس مضمون میں ناول نگار اور ادب کے نوبل انعام یافتہ ماریو ورگاس لوسا عالمی سرمایہ داری کی ثقافت کو آلودہ کرنے یا ختم کرنے کے خدشات کو دور کرتے ہیں اور یہ دلیل دیتے ہیں کہ "اجتماعی شناخت" کے تصورات غیر انسانی ہیں اور شناخت "انسانوں کی ان اثرات کا مقابلہ

کرنے اور ان کے خلاف اپنی ایجاد کی آزادانہ کارروائیوں کے ساتھ مزاحمت کرنے کی صلاحیت " سے ابھرتی ہے۔

ماریو ورگاس لوسا ایک عالمی شہرت یافتہ ناول نگار اور عوامی دانشور ہیں۔ 2010 میں "اقتدار کی ساختوں کی نقشہ بندی اور فرد کی مزاحمت، بغاوت اور شکست کی ان کی شدید تصاویر کے لئے "انہیں ادب کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔ وہ "دی فیسٹ آف دی گوٹ (The Feast of the Goat)"، "دی وار آف دی اینڈ آف دی ورلڈ (The War of the End of the World)"، "آنٹ جولیا اینڈ دی اسکرپٹ رائٹر (Aunt Julia and the Scriptwriter)"، "دی بیڈ گرل (The Bad Girl)"، "دی ریئل لائف آف الیجینڈرو مایٹا (The Real Life of Alejandro Mayta)" اور دیگر بہت سے افسانوی کاموں کے مصنف ہیں۔

یہ مضمون 1 جنوری 2001 کے "فارن پالیسی" کے شمارے سے مصنف کی اجازت سے دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔

گلوبلائزیشن (عالمگیریت) کے خلاف سب سے مؤثر حملے عام طور پر معاشی نہیں ہوتے بلکہ، وہ سماجی، اخلاقی، اور سب سے بڑھ کر ثقافتی ہوتے ہیں۔ یہ دلائل 1999 میں سیئٹل کی ہنگامہ آرائی کے دوران سامنے آئے اور حال ہی میں ڈیوس، بنکاک، اور پراگ میں گونجے۔ وہ کہتے ہیں:

قومی سرحدوں کے غائب ہونے اور مارکیٹوں کے ذریعے منسلک دنیا
کے قیام سے علاقائی اور قومی ثقافتوں اور ان کی روایات، اقدار،
رسومات اور آداب کے خاتمے کا خطرہ ہے جو ہر ملک یا علاقے کی ثقافتی
شناخت کا تعین کرتی ہیں۔ چونکہ دنیا کی بیشتر آبادی ترقی یافتہ ممالک یا
زیادہ تر اہم نکتہ یہ کہ سپر پاور، امریکہ کی طرف سے آنے والے ثقافتی
مصنوعات کے حملے کے خلاف مزاحمت کرنے کے قابل نہیں ہے
اس لیے ناگزیر طور پر عظیم بین الاقوامی کارپوریشنز کے ساتھ آنے
والی شمالی امریکی ثقافت بالآخر دنیا پر غالب آجائے گی اور اس کے
شاندار متنوع ثقافتوں کو ختم کر دے گی۔

اس طرح نہ صرف چھوٹی اور کمزور بلکہ باقی تمام قومیں اپنی شناخت اور
روح کھو دیں گی اور اکیسویں صدی کی نو آبادیات بن جائیں گی—
زومبیز یا مسخ شدہ نقشے جو ایک نئے سامراجیت کے ثقافتی اصولوں کے
مطابق ہوں گے، جو نہ صرف اپنے سرمائے، فوجی طاقت اور سائنسی
علم کے ساتھ کرہ ارض پر حکومت کرے گا بلکہ دوسروں پر اپنی زبان
اور سوچنے، یقین کرنے، لطف اندوز ہونے، اور خواب دیکھنے کے
طریقے مسلط کرے گا۔

یہ ڈراؤنا خواب یا منفی تصور ایک ایسی دنیا کا ہے جو عالمگیریت کی بدولت اپنی لسانی اور ثقافتی
تنوع کھو رہی ہے اور جسے امریکہ ثقافتی طور پر اپنانے کا عمل کر رہا ہے۔ یہ تصور صرف بائیں

بازو کے سیاستدانوں تک محدود نہیں ہے جو مارکس، ماؤ، یا چے گویرا سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ ظلم اور ستم کا یہ فریب، شمالی امریکی جیسے دیو کے خلاف نفرت اور غصے سے پیدا ہوا اور ترقی یافتہ ممالک اور اعلیٰ ثقافتوں والے ممالک میں بھی پایا جاتا ہے اور یہ بائیں، مرکز اور دائیں بازو کے سیاسی حلقوں میں مشترک ہے۔

یہ فرانس کا مشہور اور بدنام زمانہ معاملہ ہے، جہاں ہم اکثر حکومت کی جانب سے فرانسیسی "ثقافتی شناخت" کی دفاع میں مہمات دیکھتے ہیں جو کہ عالمگیریت سے مبینہ طور پر خطرے میں ہے۔ دانشوروں اور سیاستدانوں کی ایک بڑی تعداد اس بات پر پریشان ہے کہ وہ زمین جس نے مونٹینیا (Montaigne)، ڈیکارٹ (Descartes)، رسین(Racine) اور بوڈلیئر (Baudelaire) کو جنم دیا تھا—اور ایک ایسا ملک جو طویل عرصے تک لباس، خیالات، فن، کھانے، اور روحانی معاملات میں فیشن کا فیصلہ کرنے والا رہا ہے—مکڈونلڈز، پیزا ہٹ، کینٹکی فرائیڈ چکن، راک، ریپ، ہالی وڈ کی فلموں، بلیو جینز، اسنیکرز، اور ٹی شرٹس کے ذریعے "حملے" کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس خوف کے نتیجے میں مثال کے طور پر مقامی فلمی صنعت کے لیے بڑے پیمانے پر فرانسیسی سبسڈی دی گئی ہے اور تھیٹروں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ ایک مخصوص تعداد میں قومی فلمیں دکھائیں اور امریکی فلموں کی درآمدات کو محدود کریں۔ یہ خوف اسی وجہ سے بھی ہے کہ بلدیاتی اداروں نے سخت ہدایات جاری کیں کہ مولیئر (Molière) کی زبان میں انگریزی زدہ اشتہارات دینے والوں پر بھاری جرمانے عائد کیے جائیں گے۔ (اگرچہ، پیرس کی سڑکوں پر ایک پیدل چلنے والے کے نقطہ نظر سے، ان ہدایات پر مکمل عمل نہیں کیا گیا تھا۔) یہی وجہ ہے کہ José Bové ، کسان جو کہ la malbouffe(غیر معیاری خوراک) کے خلاف جنگجو ہیں، فرانس میں ایک مقبول ہیرو بن

چکے ہیں۔ اور حال ہی میں انہیں تین ماہ قید کی سزا سنانے سے ان کی مقبولیت میں شاید مزید اضافہ ہوا ہے۔

اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ عالمگیریت کے خلاف یہ ثقافتی دلیل ناقابل قبول ہے، ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ اس کے اندر ایک ناقابل انکار سچائی چھپی ہے۔ اس صدی میں وہ دنیا جس میں ہم رہیں گے، وہ اتنی تصویری اور مقامی رنگت سے بھری ہوئی نہیں ہو گی جتنی وہ تھی جسے ہم نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ تہوار، لباس، رسوم، تقریبات، رسومات، اور عقائد جو ماضی میں انسانیت کو اس کے لوک (فولکلورک) اور نسلی (ethnological) تنوع دیتے تھے، بتدریج غائب ہو رہے ہیں یا اقلیتی شعبوں تک محدود ہو رہے ہیں، جبکہ معاشرے کا بڑا حصہ انہیں چھوڑ کر ہمارے وقت کی حقیقت کے مطابق دوسرے اختیار کر رہا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک اس عمل کا سامنا کر رہے ہیں، مگر کچھ دوسروں کے مقابلے میں تیز تر ہیں۔ لیکن یہ عالمگیریت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ جدیدیت کی وجہ سے ہے، جس کا سابق وجہ کی بجائے اثر ہے۔ یقینی طور پر اس عمل کے وقوع پذیر ہونے پر افسوس کرنا ممکن ہے اور خاص طور پر موجودہ وقت کے آرام دہ اور پرسکون نقطہ نظر سے ماضی کے اس طرز زندگی کے گم ہونے پر افسوس محسوس کرنا جو تفریح، انفرادیت، اور رنگ سے بھرپور نظر آتے ہیں لیکن یہ عمل ناگزیر ہے۔ کیوبا یا اور شمالی کوریا جیسے ممالک میں مطلق العنان حکومتیں، جو اس خوف سے کہ کوئی بھی ملنا جلنا انہیں تباہ کر دے گا، خود کو بند کر لیتے ہیں اور جدیدیت کے خلاف تمام قسم کی پابندیاں اور سینسر شپ جاری کرتے ہیں۔ لیکن وہ بھی جدیدیت کی سست رفتار دراندازی اور ان کی نام نہاد ثقافتی شناخت کو بتدریج ختم ہونے سے روکنے کے قابل نہیں ہیں۔ نظریاتی طور پر شاید کوئی ملک اس شناخت کو برقرار رکھ سکتا ہے، لیکن صرف اس صورت میں جیسے کہ

افریقہ یا ایمیزون کے کچھ دور دراز قبائل، یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ مکمل تنہائی میں رہیں، دوسرے ممالک سے تمام تبادلے کو منقطع کریں اور خود کفالت کو عمل میں لائیں۔ اس شکل میں محفوظ ثقافتی شناخت اس معاشرے کو ما قبل تاریخ کے معیار زندگی تک لے جائے گی۔

یہ سچ ہے کہ جدیدیت بہت سی روایتی زندگی کی صورتوں کو ختم کر دیتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ مواقع بھی فراہم کرتی ہے اور معاشرے کے لیے ایک اہم قدم آگے بڑھاتی ہے۔ اسی لئے جب آزادانہ انتخاب کا موقع دیا جاتا ہے، تو لوگ بعض اوقات ان کے رہنما یا دانشور روایتی پسندوں کے مقابلے میں بغیر کسی ابہام کے جدیدیت کا انتخاب کرتے ہیں۔

عالمگیریت کے خلاف الزامات اور ثقافتی شناخت کے حق میں ہونے والی بحث ایک جامد تصور کو ظاہر کرتی ہے جو تاریخی بنیادوں سے خالی ہے۔ کون سی ثقافتیں وقت کے ساتھ ایک جیسی اور بغیر تبدیلی کے رہی ہیں؟ ان کو ہمیں چھوٹے اور قدیم جادوئی مذہبی کمیونٹیز کے بیچ تلاش کرنا پڑے گا جو غاروں میں رہتی ہیں، گرج چمک (بجلی) اور جانوروں کی عبادت کرتی ہیں اور اپنی قدیمی حالت کی وجہ سے استحصال اور تباہی کے خطرے میں ہیں۔ باقی تمام ثقافتیں، خاص طور پر وہ جنہیں جدید اور زندہ کہلانے کا حق ہے، اس قدر ترقی کر چکی ہیں کہ وہ صرف اپنی پچھلی دو یا تین نسلوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ ترقی فرانس، اسپین اور انگلینڈ جیسے ممالک میں واضح ہے، جہاں پچھلے نصف صدی میں اتنی شاندار اور گہری تبدیلیاں آئی ہیں کہ ایک مارسل پروسٹ(Marcel Proust)، ایک فیڈریکو گارسیا لورکا(Federico García Lorca)، یا ایک ورجینیا وولف(Virginia Woolf) آج ان معاشروں کو شاید ہی پہچان

پائیں گے جن میں وہ پیدا ہوئے تھے — وہ معاشرے جن کی تخلیقات نے ان کی تجدید میں بہت مدد کی تھی۔

"ثقافتی شناخت" کا تصور خطرناک ہے۔ سماجی نقطہ نظر سے یہ محض ایک مشکوک مصنوعی تصور کی نمائندگی کرتا ہے، لیکن سیاسی نقطہ نظر سے یہ انسانیت کی سب سے قیمتی کامیابی آزادی کے لیے خطرہ ہے۔ میں انکار نہیں کرتا کہ جو لوگ ایک ہی زبان بولتے ہیں، ایک ہی علاقے میں پیدا ہوتے اور رہتے ہیں، ایک ہی مسائل کا سامنا کرتے ہیں، اور ایک ہی مذاہب اور رواجوں کی پیروی کرتے ہیں، ان میں کچھ مشترکہ خصوصیات ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اجتماعی فرق کبھی بھی ان میں سے ہر ایک کو مکمل طور پر بیان نہیں کر سکتا اور یہ انفرادیت کی خصوصیات اور صفات کے مجموعہ کو جو ایک رکن کو دوسرے سے مختلف کرتی ہیں، یا تو مکمل طور پر ختم کر دیتا ہے یا انہیں ایک کمتر درجہ پر لے جاتا ہے۔ جب شناخت کا تصور انفرادی پیمانے پر استعمال نہ کیا جائے تو یہ فطری طور پر تخفیف پسند اور غیر انسانی ہے، یہ انسان کے اندر کی تمام تخلیقی اور اصلی چیزوں کا ایک اجتماعی اور نظریاتی تصور ہے، جو وراثت، جغرافیہ یا سماجی دباؤ سے عائد نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ سچی شناخت انسانوں کی صلاحیت سے جنم لیتی ہے کہ وہ ان اثرات کے خلاف مزاحمت کر سکیں اور اپنے ایجاد کردہ آزادانہ اعمال کے ساتھ ان کا مقابلہ کر سکیں۔

"اجتماعی شناخت" کا تصور ایک نظریاتی افسانہ ہے اور قوم پرستی کی بنیاد ہے۔ بہت سے ماہرین نسلیات اور ماہرین بشریات کے لیے، اجتماعی شناخت حتی کہ سب سے قدیم کمیونٹیز میں بھی حقیقت کی نمائندگی نہیں کرتی۔ مشترکہ طریقے اور رواج ایک گروپ کے دفاع کے لیے

اہم ہو سکتے ہیں، لیکن اس کے اراکین کے لیے گروپ سے آزاد ہونے کی تخلیقی صلاحیت ہمیشہ بہت بڑی ہوتی ہے اور جب افراد کو ان کے اپنے حالات میں جانچا جائے تو انفرادی اختلافات اجتماعی خصوصیات پر غالب آتے ہیں نہ کہ انہیں محض اجتماعیت کے پیریفرل عناصر کے طور پر دیکھا جائے۔ عالمگیریت اس کرہ ارض کے تمام شہریوں کو ان کی ثقافتی شناختوں کو رضاکارانہ عمل کے ذریعے تعمیر کرنے کی وسیع پیمانے پر ممکنات فراہم کرتی ہے، جو ان کی ترجیحات اور ذاتی محرکات کے مطابق ہوتی ہیں۔ اب شہریوں کو ہمیشہ، ماضی کی طرح اور موجودہ وقت کے بہت سے مواقع کی طرح، ایک ایسی شناخت کا احترام کرنے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا جو انہیں ایک حراستی کیمپ میں پھنسائے رکھتی ہے جس سے کوئی فرار نہیں ہے—وہ شناخت جو ان پر ان کی پیدائش کی جگہ کی زبان، قوم، چرچ، اور رواجوں کے ذریعے عائد کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے عالمگیریت (گلوبلائزیشن) کو خوش آمدید کہنا چاہیے کیونکہ یہ انفرادی آزادی کے افق کو نمایاں طور پر وسعت دیتی ہے۔

ایک براعظم کی دو تاریخیں

شاید لاطینی امریکہ اجتماعی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی فنکاری اور مضحکہ خیزی کی بہترین مثال ہے۔ لاطینی امریکہ کی ثقافتی شناخت کیا ہو سکتی ہے؟ عقائد، رسم و رواج، روایات، عملی طریقوں، اور داستانوں کا ایسا مربوط مجموعہ کیا ہوگا جو اس خطے کو ایک منفرد شخصیت، انوکھا اور ناقابلِ منتقلی وجود فراہم کرے؟ ہماری تاریخ میں فکری بحثوں میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش میں شدید جعل سازی کی گئی ہے۔ سب سے مشہور بحث وہ تھی جو بیسویں

صدی کے اوائل میں شروع ہوئی اور ہسپانوی ثقافت کے حامیوں اور انڈین ثقافت کے حامیوں کے درمیان پوری براعظم میں گونجی۔

ہسپانوی ثقافت کے حامیوں جیسے کہ جوزے ڈی لا ریوا اگویرو(José de la Riva Agüero)، وکٹر انڈریس بیلاونڈے(Victor Andrés Belaúnde)اور فرانسسکو گارسیا کالڈیرون(Francisco García Calderón)کے لئے لاطینی امریکہ اس وقت پیدا ہوا جب دریافت اور فتح کی بدولت، یہ ہسپانوی اور پرتگالی زبانوں کے ساتھ ملا اور عیسائیت کو اپنا کر مغربی تہذیب کا حصہ بنا۔ ہسپانوی حامیوں نے قبل از ہسپانوی ثقافتوں کو کم نہیں سمجھا بلکہ ان کو ایک تہہ تصور کیا اور وہ بھی بنیادی تہہ نہیں جو سماجی اور تاریخی حقیقت کو مکمل کرتی ہے بلکہ جو صرف مغرب کے زندہ کرنے والے اثرات کی بدولت اپنی فطرت اور شخصیت کو مکمل کرتی ہے۔

دوسری طرف انڈین ثقافت کے حامیوں نے یورپیوں کے لاطینی امریکہ کے لئے لائے جانے والے مبینہ فوائد کو اخلاقی غصے کے ساتھ مسترد کیا۔ ان کے لئے ہماری شناخت کی جڑیں اور روح قبل از ہسپانوی ثقافتوں اور تہذیبوں میں پائی جاتی ہیں، جن کی ترقی اور جدیدیت کو تشدد کے ذریعے نہ صرف تین نوآبادیاتی صدیوں کے دوران بلکہ جمہوریت کے آنے کے بعد بھی سنسرشپ، جبر، اور پسماندگی کے ساتھ بھی بے رحمی سے روکا گیا۔ انڈین سوچ کے مطابق، حقیقی "امریکی اظہار(American expression)"(جیسا کہ جوزے لیزاما لیما(José Lezama Lima)کی کتاب کا عنوان ہے) تمام ثقافتی مظاہر میں موجود ہے — جیسے کہ مقامی زبانیں، عقائد، رسوم، فنون، اور عوامی رواج — جو مغربی ثقافتی جبر کا مقابلہ کرتی ہیں اور

آج تک قائم ہیں۔ اس مکتبہ فکر کے ایک ممتاز مورخ، پیرو کے لوئیس ای والکارسل (Peruvian Luis E. Valcárcel) نے حتیٰ کہ یہ تک کہا کہ گرجا گھروں، کانونٹس، اور نوآبادیاتی فن تعمیر کے دوسرے یادگاروں کو جلانا چاہیئے کیونکہ یہ "اینٹی پیرو (Anti-Peru)" کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ دھوکے باز اور خالص (قدیم) امریکی شناخت کے نفی ہیں جو صرف اور صرف مقامی جڑوں کی ہو سکتی ہے۔ اور لاطینی امریکہ کے ایک سب سے اصلی ناول نگار جوزے ماریا آرگوئید (José María Arguedas) نے مغرب کی گھٹن اور مسخ کن موجودگی کے باوجود بڑی حساسیت اور زبردست اخلاقی احتجاج کے قصے میں اینڈین دنیا (Andean world) میں کیچوا ثقافت کے بقا کی مہاکاوی داستان بیان کی۔

ہسپانی ازم اور انڈین ازم (مقامیت / indigenism) نے بہترین تاریخی مضامین اور نہایت تخلیقی افسانوی کاموں کو جنم دیا، لیکن ہمارے موجودہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو دونوں نظریات برابر طور پر فرقہ وارانہ، مختصر اور غلط معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں ہی لاطینی امریکہ کی وسیع تنوع کو اپنی نظریاتی پابندیوں میں فٹ کرنے کے قابل نہیں ہیں اور دونوں میں نسل پرستی کی بو آتی ہے۔ آج کے دور میں کون یہ دعویٰ کرنے کی جرات کرے گا کہ صرف "ہسپانوی" یا "انڈین" ہی ہیں جو لاطینی امریکہ کی حقیقی نمائندگی کرتی ہیں؟ اس کے باوجود، ہماری مخصوص "ثقافتی شناخت" کو قائم کرنے اور الگ کرنے کی کوششیں آج بھی جاری ہیں اور اس کے لیے ایک سیاسی اور علمی جوش و خروش ہے جو کہ زیادہ قابل قدر مقاصد کا مستحق ہے۔ لوگوں پر ایک ثقافتی شناخت مسلط کرنے کی کوشش کرنا انہیں قید میں بند کرنے کے مترادف ہے اور انہیں سب سے قیمتی آزادی سے محروم کرنا ہے، جیسے کہ وہ کیا، کیسے اور کون

ہونا چاہتے ہیں۔ لاطینی امریکہ میں ایک نہیں بلکہ کئی ثقافتی شناختیں ہیں؛ ان میں سے کوئی بھی دوسروں سے زیادہ جائز یا خالص ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

بلاشبہ، لاطینی امریکہ میں قبل ہسپانوی دنیا اور اس کی ثقافتیں شامل ہیں، جو کہ میکسیکو، گوئٹے مالا اور اینڈین ممالک میں ابھی بھی سماجی طور پر بہت زیادہ اثر و رسوخ رکھتی ہیں۔ لیکن لاطینی امریکہ ایک وسیع تعداد میں ہسپانوی اور پرتگالی بولنے والوں کا ایک جھرمٹ بھی ہے جو پانچ صدیوں کی روایت کے حامل ہیں اور جن کی موجودگی اور اقدامات نے براعظم کو اس کی موجودہ خصوصیات دینے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ اور کیا لاطینی امریکہ میں کچھ افریقی بھی شامل نہیں ہے، جو یورپ کے ساتھ ہماری ساحلوں پر آیا؟ کیا افریقی موجودگی نے ہماری جلد، ہماری موسیقی، ہماری انفرادی خصوصیات اور ہمارے معاشرے پر انمٹ نشان نہیں چھوڑے؟ لاطینی امریکہ کو تشکیل دینے والے ثقافتی، نسلی اور سماجی عناصر ہمیں دنیا کے تقریباً تمام خطوں اور ثقافتوں سے جوڑتے ہیں۔ ہمارے پاس اتنی زیادہ ثقافتی شناختیں ہیں کہ یہ ایک طرح سے کسی ایک شناخت نہ رکھنے کے برابر ہے۔ قوم پرستوں کے عقائد کے برعکس یہ ہمارا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ یہ ایک سند بھی ہے جو ہمیں ہمارے گلوبل دنیا میں ایک مکمل شہری ہونے کا احساس دلاتی ہے۔

مقامی آوازیں، عالمی رسائی

کرہ ارض کی امریکنائزیشن کا خوف حقیقت سے زیادہ نظریاتی پاگل پن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گلوبلائزیشن کے ساتھ انگریزی ہمارے وقت کی عمومی زبان بن گئی ہے، جیسے کہ قرون وسطیٰ میں لاطینی تھی اور یہ اپنے عروج کو جاری رکھے گی کیونکہ یہ بین الاقوامی لین

دین اور مواصلات کے لیے ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔ لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی دیگر عظیم زبانوں کی قیمت پر ترقی کرتی ہے؟ بالکل بھی نہیں۔ در حقیقت، اس کے بر عکس سچ ہے۔ سرحدوں کے غائب ہونے اور ایک بڑھتے ہوئے باہمی انحصار کرنے والی دنیا نے، نہ صرف بطور شوق بلکہ ضرورت کے تحت بھی نئی نسلوں کے لیے دوسرے ثقافتوں کو سیکھنے اور ان میں جذب ہونے کی ترغیبات پیدا کی ہیں، کیونکہ کئی زبانوں کو بولنے کی صلاحیت اور مختلف ثقافتوں میں آرام سے نقل و حرکت کرنا پیشہ ورانہ کامیابی کے لیے ضروری بن گیا ہے۔ ہسپانوی زبان کے معاملے کو ہی دیکھ لیں۔ نصف صدی قبل، ہسپانوی بولنے والے ایک باطنی نظر آنے والی کمیونٹی تھی؛ ہم خود کو اپنی روایتی لسانی حدود سے آگے بہت محدود طریقوں سے پیش کرتے تھے۔ آج ہسپانوی متحرک اور فروغ پزیر ہے، پانچوں براعظموں پر ساحلوں یا حتی کہ وسیع زمینوں پر قبضہ کر رہی ہے۔ اس حقیقت کی وجہ سے کہ آج امریکہ میں پچیس سے تیس ملین ہسپانوی بولنے والے ہیں، حالیہ دو امریکی صدارتی امیدواروں ٹیکساس کے گورنر جارج ڈبلیو بش (George W. Bush) اور نائب صدر ال گور (Al Gore)، نے نہ صرف انگریزی بلکہ ہسپانوی میں بھی مہم چلائی۔

کتنے لاکھوں نوجوان مرد اور عورتیں دنیا بھر میں گلوبلائزیشن کے چیلنجوں کا جواب دے کر جاپانی، جرمن، مینڈارن، کینٹونیز، روسی یا فرانسیسی زبان سیکھ چکے ہیں؟ خوش قسمتی سے یہ رجحان آنے والے سالوں میں صرف بڑھتا جائے گا۔ اسی وجہ سے ہماری اپنی ثقافتوں اور زبانوں کا بہترین دفاع یہ ہے کہ انہیں اس نئی دنیا میں زور و شور سے فروغ دیں، نہ کہ انگریزی کے خطرے کے خلاف انہیں بچانے کی سادہ لوح کوشش کریں۔ وہ جو ایسے علاج پیش کرتے ہیں ثقافت کے بارے میں بہت بات کرتے ہیں، لیکن وہ لوگ اکثر جاہل ہوتے

ہیں جو اپنی حقیقی رغبت یعنی قوم پرستی کو چھپاتے ہیں۔ اور اگر کوئی چیز ثقافت کے آفاقی رجحانات کے خلاف ہے، تو وہ محدود، اخراجی اور الجھی ہوئی نظر ہے جو قوم پرست نقطہ نظر ثقافتی زندگی پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ثقافتیں ہمیں جو سب سے زیادہ قابل تعریف سبق سکھاتی ہیں وہ یہ ہے کہ انہیں بیوروکریٹس یا کمساروں (commissars) کے ذریعے محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، انہیں لوہے کی سلاخوں کے پیچھے محدود یا کسٹم سروسز کے ذریعے الگ تھلگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے تاکہ وہ زندہ اور شاداب رہیں؛ اس کے برعکس ایسی کوششیں صرف ثقافت کو مرجھادیں گی یا یہاں تک کہ اس کی اہمیت کم کریں گی۔ ثقافتوں کو مختلف ثقافتوں کے ساتھ مسلسل مقابلہ کرتے ہوئے آزادانہ طور پر زندہ رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ انہیں نئی زندگی بخشتی ہے اور انہیں مسلسل بہاؤ کے ساتھ ارتقا اور مطابقت کرنے دیتی ہے۔ قدیم دور میں، لاطینی نے یونانی کو نہیں مارا؛ اس کے برعکس، یونانی ثقافت کی فنی اور فکری گہرائی نے رومن تہذیب میں سرایت کی اور اس کے ذریعے ہومر کی نظمیں اور افلاطون اور ارسطو کے فلسفے پوری دنیا تک پہنچے۔ گلوبلائزیشن مقامی ثقافتوں کو غائب نہیں کرے گی؛ عالمی کھلے پن کے فریم ورک میں مقامی ثقافتوں میں جو کچھ بھی قیمتی اور بقا کے لائق ہو گا اسے پھلنے پھولنے کے لیے زرخیز زمین ملے گی۔

یہ یورپ میں ہر جگہ ہو رہا ہے، خاص طور پر سپین میں قابل ذکر ہے، جہاں علاقائی ثقافتیں خصوصی جوش کے ساتھ دوبارہ ابھر رہی ہیں۔ جنرل فرانسسکو فرانکو (General Francisco Franco) کی آمریت کے دوران، علاقائی ثقافتوں کو دبایا گیا اور انہیں پوشیدہ وجود میں رہنے پر مجبور کیا گیا۔ لیکن جمہوریت کی واپسی کے ساتھ اسپین کی امیر ثقافتی تنوع کو آزاد کر دیا گیا اور اسے آزادانہ طور پر ترقی کرنے کی اجازت دی گئی۔ ملک کے خود مختاری کے

نظام میں خاص طور پر کیتالونیا، گالیشیا، اور باسک ملک بلکہ اسپین کے باقی حصوں میں بھی مقامی ثقافتوں نے غیر معمولی عروج حاصل کیا ہے، بلاشبہ، ہمیں اس علاقائی ثقافتی احیاء کو جو کہ مثبت اور فائدہ مند ہے، قوم پرستی کے مظہر سے نہیں الجھانا چاہئے، جو آزادی کی ثقافت کے لئے سنگین خطرات پیدا کرتا ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S. Eliot)نے 1948 کی اپنی مشہور تحریر "نوٹس ٹوورڈز دی ڈیفینیشن آف کلچر(Notes Towards the Definition of Culture)"میں پیش گوئی کی تھی کہ مستقبل میں انسانیت مقامی اور علاقائی ثقافتوں کا احیاء دیکھے گی۔ اس وقت اس کی پیش گوئی کافی جراتمندانہ لگ رہی تھی۔ تاہم، گلوبلائزیشن شاید اکیسویں صدی میں اسے حقیقت بنادے گی اور ہمیں اس پر خوش ہونا چاہئے۔

چھوٹی، مقامی ثقافتوں کا احیاء انسانیت کو وہ غنی تنوع واپس دے گا جسے قومی ریاست نے اٹھارویں کے آخر اور خاص طور پر انیسویں صدی میں نام نہاد قومی ثقافتی شناخت بنانے کے لیے فنا کر دیا تھا۔ (اس حقیقت کو آسانی سے فراموش کیا جاتا ہے، یا ہم اس کے سنگین اخلاقی مفہوم کی وجہ سے اسے بھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔)

قومی ثقافتوں کو اکثر خون اور آگ میں جھونک دیا جاتا تھا، جس میں مقامی زبانوں کی تعلیم یا اشاعت یا مذاہب اور رسوم کے رواج پر پابندی لگائی جاتی تھی جو ان سے اختلاف کرتے تھے۔ قومی ریاست کو مثالی سمجھا جاتا ہے۔

اس طرح، دنیا کے بہت سے ممالک میں، قومی ریاست نے مقامی ثقافتوں پر ایک غالب ثقافت زبردستی مسلط کر دی جو سرکاری زندگی سے دبائی اور ختم کر دی گئی تھیں۔ لیکن، ان لوگوں کی تنبیہات کے برخلاف جو گلوبلائزیشن سے خوفزدہ ہیں، ثقافتوں کو مکمل طور پر مٹانا آسان نہیں ہے—چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہوں—اگر ان کے پیچھے ایک غنی روایت اور لوگ ہوں جو انہیں عمل میں لاتے ہیں، چاہے خفیہ طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ اور آج قومی ریاست کے کمزور ہونے کی بدولت، ہم بھولی ہوئی، پسماندہ، اور خاموش مقامی ثقافتوں کو دوبارہ ابھرتے اور اس گلوبلائزڈ کرہ ارض کے عظیم میلے میں زندگی کی متحرک علامات کو ظاہر کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

مزید مطالعہ برائے تفریح اور فائدہ (اور بہتر اسکول پیپرز)

سرمایہ داری کی اخلاقیات پر موجود ادب وسیع ہے۔ اس کا بیشتر حصہ فضول ہے۔ یہاں چند قابل مطالعہ کتابیں ہیں جو آپ کو سرمایہ داری کے گرد موجود مسائل کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی ہے، لیکن اس کتاب 'The Morality of Capitalism' میں موجود مضامین میں پہلے ہی بہت سی دیگر کتابوں اور مضامین کا حوالہ دیا گیا ہے، جن میں سمتھ، مائیزز، ہائیک، رینڈ، میک کلوسکی، اور دیگر آزاد منڈی کے سرمایہ داری کے دفاع کرنے والوں کے کام شامل ہیں۔ لہذا اس کتاب کے مضامین میں دیئے گئے حوالہ جات کی پیروی کرنے سے نہ گھبرائیں۔ نیچے دی گئی کتابوں کی فہرست جو مصنف یا ایڈیٹر کے نام کے لحاظ سے حروف تہجی میں ہے، آپ کو کچھ مفید ذہنی مشق فراہم کرے گی۔

– ٹام جی پالمر

The Morals of Markets and Related Essays, by H. B. Acton (Indianapolis: Liberty Fund, 1993)

برطانوی فلسفی ایچ بی ایکٹن نے منافع، مسابقت، انفرادیت اور اجتماعیت، منصوبہ بندی، اور بہت سے دوسرے موضوعات کے بارے میں واضح اور سمجھداری سے لکھا۔

Morals and Markets: An Evolutionary Account of the Modern World, by Daniel Friedman (New York: Palgrave Macmillan, 2008)

مصنف بازاروں اور اخلاقیات کی متوازی ارتقاء پر بصیرت پیش کرتا ہے اور دونوں کو بہتر بنانے کے لئے کچھ متنازعہ تجاویز دیتا ہے۔

The Fatal Conceit: The Errors of Socialism, by F. A. Hayek (Chicago: University of Chicago Press, 1988)

ہائیک نے اقتصادیات میں نوبل انعام حاصل کیا، لیکن وہ صرف ایک "معاشیاتی ماہر" نہیں تھے۔ یہ مختصر کتاب جو کہ ان کی آخری کتاب ہے، ان کی تحقیق کی بہت سی دلچسپیوں کو اکٹھا کرتی ہے اور آزاد منڈی کی سرمایہ داری کے حق میں ایک وسیع مقدمہ پیش کرتی ہے۔

The Ethics of Redistribution, by Bertrand de Jouvenel (Indianapolis: Liberty Fund, 1990)

یہ بہت مختصر کتاب مشہور فرانسیسی سیاسی عالم کے کیمبرج یونیورسٹی میں دیے گئے لیکچرز پر مبنی ہے۔ ابواب مختصر اور جامع ہیں اور آمدنی کی زیادہ برابری حاصل کرنے کے لیے آمدنی کی دوبارہ تقسیم کی کوششوں کے اخلاقی بنیادوں اور نتائج کا جائزہ لیتے ہیں۔

Discovery and the Capitalist Process, by Israel Kirzner (Chicago: University of Chicago Press, 1985).

ایک "آسٹریائی" معیشت دان سرمایہ داری، مداخلت پسندی، اور سوشیالزم کا جائزہ کاروباری سرگرمی کے نقطہ نظر سے لیتا ہے اور چوکسی، جدت، ترغیبات، اور منافع کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں کرتا ہے۔

The Ethics of the Market, by John Meadowcraft (New York: Palgrave Macmillan, 2005)

آزاد منڈی کی سرمایہ داری کے مختلف دشمنوں کی طرف سے اٹھائے گئے مسائل کا ایک مختصر جائزہ۔

The Origins of Virtue: Human Instincts and the Evolution of Cooperation, by Matt Ridley (New York: Viking, 1997)

ریڈلے ایک ماہر حیوانات (زولوجسٹ) اور پیشہ ور سائنس لکھاری ہیں جنہوں نے اپنی دانش کو انسانی رویے کو ارتقائی حیاتیات کے نقطہ نظر سے سمجھنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ فضیلت، ملکیت، اور تجارت کے بارے میں ان کی بصیرتیں مددگار اور پڑھنے میں دلچسپ ہیں۔

The Economics of Rights, Co-operation, and Welfare, by Robert Sugden (London: Palgrave Macmillan, 2005)

مصنف کھیلوں کے نظریئے (Game Theory) کے نقطہ نظر سے ملکیت اور تبادلے کی اخلاقیات پر ایک بہت آسان نظر پیش کرتا ہے۔ ریاضی بہت بنیادی ہے (واقعی) اور فلسفی ڈیوڈ ہیوم کی عظیم بصیرتوں کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

Moral Markets: The Critical Role of Values in the Economy, ed. by Paul J. Zak (Princeton: Princeton University Press, 2008)

اس کتاب میں شامل مضامین بازاروں کی اخلاقیات کے بارے میں بہت سے موضوعات کا جائزہ لیتے ہیں اور کھیلوں کے نظریئے، حیاتیات، نفسیات، اور دیگر شعبوں سے جدید سائنسی بصیرتیں پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ٹام جی پالمر اٹلس نیٹ ورک (Atlas Network)میں بین الاقوامی
پروگراموں کے ایگزیکٹو وائس پریزیڈنٹ ہیں اور دنیا بھر میں کلاسیکی لبرل ازم کے
اصولوں کو فروغ دینے کے لیے کام کرنے والی ٹیموں کی نگرانی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر پالمر
کیٹو انسٹی ٹیوٹ(Cato Institute) کے سینئر فیلو ہیں، جہاں وہ پہلے بین الاقوامی
پروگراموں کے وائس پریزیڈنٹ اور انسانی حقوق کے فروغ کے مرکز کے ڈائریکٹر
تھے۔ پالمر ہیر فورڈ کالج، آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایچ۔ بی۔ ارہارت(H. B.
Earhart Fellow) فیلو تھے اور جورج میسن یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ فار ہیومین
اسٹڈیز کے وائس پریزیڈنٹ بھی رہے ہیں۔ وہ اسٹوڈنٹس فار لبرٹی کے بورڈ آف
ایڈوائزر کے رکن ہیں۔ انہوں نے سیاست اور اخلاقیات پر ہارورڈ جرنل آف لا اینڈ
پبلک پالیسی، ایتھکس، کرٹیکل ریویو، اور کنسٹی ٹیوشنل پولیٹیکل اکنامی جیسے علمی
جرائد میں اور اسٹریٹ، وال اسٹریٹ جرنل، نیویارک ٹائمز، ڈائی ویلت، ال حیات،
کاکسنگ، واشنگٹن پوسٹ اور لندن اسپیکٹیٹر(Harvard Journal of Law
and Public Policy, Ethics, Critical Review, and
Constitutional Political Economy, as well as in
publications such as Slate, the Wall Street Journal, the
New York Times, Die Welt, Al Hayat, Caixing, the
Washington Post, and The Spectator of London)جیسے جریدوں
میں تبصرے اور مضامین شائع کیے ہیں۔ انہوں نے اپنی بی اے کی ڈگری لبرل آرٹس
میں سینٹ جانز کالج، ایناپولس، میری لینڈ سے؛ ایم اے کی ڈگری فلسفے میں کیتھولک

یونیورسٹی آف امریکہ، واشنگٹن ڈی سی سے؛ اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری سیاسیات میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کی علمی تحقیق پرنسٹن یونیورسٹی پریس، کیمبرج یونیورسٹی پریس، راؤٹلیج، اور دیگر تعلیمی پبلشرز کی کتابوں میں شائع ہوئی ہے اور وہ 2009 میں شائع ہونے والی کتاب "Realizing Freedom: Libertarian Theory, History, and Practice" کے مصنف ہیں۔

نیشنل انفلوونسرز ایک خود مختار اور غیر جانبدار تھنک ٹینک ہے، جس کا بنیادی مقصد معاشی، سیاسی اور فکری تحریکوں کا بنیاد بننا، داخلی معاشی اور سیاسی مشکلات کا حل تلاشنا، قانون کی حکمرانی کو یقینی بنانا اور آزاد معیشت کے ساتھ ساتھ انفرادی آزادیوں اور حقوق کیلئے مثبت پالیسیوں کے مطالبات میں اضافہ کرنا ہے۔

نیشنل انفلوونسرز سود مند پالیسیوں کی پیشکش سمیت ہم فکر اور بااثر ساتھیوں، اساتذہ، طلباء، صحافیوں اور دانشوروں کے ذریعے عام لوگوں کے سمجھانے اور قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو مستقبل میں ایک آزاد، ذمہ دار، خوشحال اور ترقی یافتہ پاکستان کا سبب بنے۔

اس کتاب کے ترجمہ کرنے کا مقصد مقامی لوگوں کو سرمایہ دارانہ نظام، اس کے عوامل اور کرونی کیپیٹلزم سے آگاہ کرنا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ان تمام قارئین کیلئے باعثِ دلچسپی ہو گی جو عالمی معیشت کے بنیادی تصورات اور اصول جاننے کے ساتھ ساتھ اس عوامی بحث میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں کہ مختلف سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کس طرح عام عوام کے زندگیوں پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اور یہ امید بھی ہے کہ سکول اور کالج کے طلباء سے لے کر کاروباری شخصیات اور حکومتی پالیسی ساز تک سب اِس کتاب کو کارآمد پائیں گے۔

محمد سلیمان
صدر نیشنل انفلوونسرز